An International Literary Urdu Magazine Globally Circulated
लंदन से सबसे अधिक प्रकाशित होने वाला उर्दू अदब का मात्र अंतरराष्ट्रीय मैगजीन।

ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

شمارہ:90ماہ جون2020ء
QINDEEL-E-ADUB INTERNATIONAL
80 STRATHDONE DRIVE LONDON SW17 0PW
(M) 0044-7886-304637, 0044-2089449385
www.qindeel-e-adub.co.uk, ranarazzaq52@gmail.com

لندن سے شائع ہونے والا میدانِ ادب کا واحد کثیر الاشاعت بین الاقوامی اردو میگزین

مسلم سائنسدان
جن پر ہمیں ناز ہے

Dr. Abdul Salam

MUHAMMAD IBN MUSA AL-KHWARIZMI

IBN BATTUTA

IBN RUSHD

OMAR KHAYYAM

THABIT IBN QURRA

ABU BAKR AL-RAZI

JABIR IBN HAIYAN

IBN ISHAQ AL-KINDI

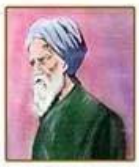
IBN AL-HAYTHAM

IBN ZUHR

IBN KHALDUN

IBN AL-BAITAR

ABU NASR AL-FARABI

AL-BATTANI

IBN SINA

''کورونا'' اک بلائے ناگہاں ہے
جدھر دیکھو قیامت کا سماں ہے
زمیں سہمی ہوئی دہشت زدہ سی
بہت خاموش گم صم آسماں ہے
بہر جانب ہے اک وحشت کا پہرا
خوشی غائب اداسی جاوداں ہے
سڑک ویراں گلی خاموش گھر چپ
کہ سناٹا زمیں تا آسماں ہے
گھروں میں قید ہیں معصوم بچے
ہراساں ایک اک پیر وجواں ہے

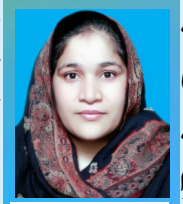
تمثیلہ لطیف

یہ کیسے کشتگانِ زندگی ہیں
جنازہ ہے نہ قبروں کا نشاں ہے
ہجومِ سوگواراں ہے نہ آنسو
مگر اک وقت ہے جو نوحہ خواں ہے
سبھی کردار ہیں مجبور جس میں
یہ کیسی بے بسی کی داستاں ہے
معالج دل شکستہ ہو رہے ہیں
عجب حسرت نصیبی کا سماں ہے
خدا ہی رحم فرمائے گا اب تو
کہ تمثیلہ وہی تو مہرباں ہے

Earlsfield Properties

Professional Residential
Property Management
Services

We will manage your
property at 0% commission
Guaranteed
Rent Schemes for 3 & 5 years.

Free Management Services
Guaranteed Vacant Possession.

Get it Right

- ✔ Member National Landlord Association
- ✔ Member Deposit Portection Schemes
- ✔ Member The Property Ombudsman Scheme
- ✔ Winner of Pakistan Achievement Award 2014 (Excellence Management)
- ✔ Vastly Experience in Housing Benefits Clients.

PLEASE CONTACT: NAVEED SARWAR (MA EUROPEAN REAL ESTATE)

175 Merton Road, London SW18 5EF

Tel: 02082656000 02088770762
Fax: 02088749754
Email: info@earlsfieldproperties.com
Web: www.earlsfieldproperties.com

مجلس ادارت

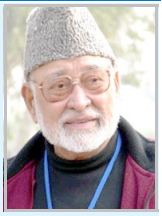

بانی اراکین

خان بشیر احمد رفیق مرحوم

آدم چغتائی مرحوم

مدیر

رانا عبدالرزاق خان

اراکین ادارتی بورڈ

ڈاکٹر منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔ امجد مرزا امجد، طارق مرزا آسٹریلیا، عبدالقدیر کوکب، بشارت احمد چیمہ۔

التماس

تمام دوستوں سے التماس ہے کہ اپنی شعری و نثری تخلیقات اور ادبی پروگرامز کی رپورٹیں وغیرہ برائے اشاعت بصورت ’’اِن پیج اردو‘‘ فائلز مع تصاویر ای میل سے روانہ فرمائیں۔ ’’قندیل ادب انٹرنیشنل‘‘ بیسیوں ممالک میں لاکھوں اردو قارئین کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ میگزین کے مندرجات پر آپ کے کمنٹ یا مختصر تبصرے ہمیں اپنا محاسبہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مضامین کے ساتھ ضروری حوالہ جات آپ کے مضامین کی افادیت کو بڑھاتے ہیں۔ آپ کی بھیجی ہوئی تمام تصاویر وغیرہ ’’کاپی رائٹ فری‘‘ ہونی چاہئیں۔ شکریہ

E-mail: ranarazzaq52@gmail.com

IMPORTANT ANNOUNCEMENT

"Qindeel-e-Adab International" magazine is a non-commercial and non-profit e-product, as well as on paper, internationally distributed free of cost for the promotion of bi-lingual poetry, fiction, informative multi purpose interesting articles etc in Urdu alphabet in the UK and Europe under the sole ownership of its Chief Editor Abdul Razzaq Khan of the address as stated elsewhere within this magazine for delivery of documents.

The magazine and the contents herein DO NOT relate to a political, religious or a social group whatsoever. The Editor does not necessarily agree with the opinions expressed by the article writers, poets etc..

Although the e-magazine is FREE OF COST to all, yet for ON PAPER copies of the magazine we do expect a reasonable amount of donation to cover the costs of printing, postage and packing for all countries as stated) Chief Editor.

فہرست مضامین

اداریہ	رانا عبدالرزاق خان	4
اُردو ہے جس کا نام	عاصی صحرائی	5
غزلیات : محمد اسحاق عاجز۔ ساجد محمود رانا۔ عاصی صحرائی۔ اقبا شیدائی۔ اسحاق عاجز۔ فیضان فیضی۔ ندیم ملک۔ فرزانہ فرحت۔ نوید اعظیم۔ میاں کاشف نسیم۔ ڈاکٹر فیاض احمد علیگ۔ جمشید مسرور۔ اطہر حفیظ فراز۔ عامر حسنی۔ لیاقت جعفری۔ منال۔ طاہر سعود کرتپوری۔ طارق طاسی۔ عبدالکریم قدسی۔ امجد رسول امجد۔ نثار ناسک۔ نیاز جَیراجپُوری۔ کامران اعظم سوہدروی۔ امین اوڈیرائی۔ رشید احمد رشید۔ امجد رسول امجد۔ مبشر شہزاد۔ ایس ایم تقی حسین۔ قسیم اختر۔ مبارک احمد عابد۔ مسعود چودھری۔ محمد علی مضطر عارفی۔ ثاقب زیروی۔ احمد منیب۔ مبارک صدیقی۔ عبدالمنان ناہید۔ امجد مرزا امجد۔ حافظ محمد مبرور۔ اسحاق ساجد۔ منور احمد کنڈے۔ راجہ محمد الیاس۔ نجمہ شاہین۔		6 تا 18
سپنے	محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب	18
پرایا بوجھ	امجد مرزا امجد	19
مبارک صدیقی سروش کی کتاب روشنی کا سفر	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	20
کینوس کے رنگوں میں اَمر ہونے والی اَمرتا شیر گل	محمد نعیم یاد۔ جوہر آباد	21
راجپوت راجہ کا تخلیق کردہ کیلنڈر۔	رجل خوشاب	22
کرونائی دور اور اہل وطن کا چلن	تمثیلہ لطیف	23
دلچسپ اور سبق آموز واقعہ	رجل خوشاب	24
سلسلہ دلداری کا (عبّاس تابش) ایک مُطالعہ	اسلم چشتی پونے	25
استنبول کی مختصر تاریخ	سید حسن خان	26
علامہ اقبال کی باتیں کتنی سچ ہیں کتنی جھوٹ	ادارہ	26
اسحاق ساجدؔ جرمنی میں برِصغیر کا ایک جمالی گیت کار	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	28
شائق نصیر پوری کی غزل کا مزاج	اسحاق ساجد جرمنی	29
سراجؔ اورنگ آبادی صاحب	ادارہ	30
حرف کی تقدیس	اے، آر، راجپوت	32
آبلہ پا	محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب	33
نامور شاعر ’’منیرؔ نیازی صاحب	ادارہ	33
کرہِ ارض ضروری مرمت کیلئے بند ہے	وسعت اللہ خان	34
معروف شاعر ’’عبدالحمید عدمؔ صاحب	ادارہ	34
جستہ جستہ	عطاء القادر طاہر	35
اقوالِ زرّیں	آفتاب احمد شاہ	35
بِسمِ اللہ کلیم۔ لڑکھڑاتی مسکراہٹ	ادارہ	37
آپا کی سلائی مشین	مبشرہ ناز	38
ایمانداری	محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب	38
سخن فہمی۔	اے آر خاں	39
اک خواب جو ٹوٹ گیا۔	محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب	40
دعوت۔ سپنے۔ آئینہ	محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب	41

اداریہ

رانا عبدالرزاق خاں

قندیل ادب ڈائجسٹ کی حیثیت رکھتا ہے

قارئین قندیل ادب اور ادیبوں، شعراء، لکھاریوں کے علم میں یہ بات بڑے ہی التماس کے گوش گزار کرنا چاہتا ہے کہ خاکسار کے شوق اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ نوے نمبر شمارہ نکال رہا ہے۔ یہ محض مولا کریم کا فضل اور احسان ہے جس نے صحت اور دماغ دے رکھا ہے۔ ساری دنیا سے شہ پارے مل رہے ہیں اور ان کو قندیل کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ اس میگزین میں بلاتفریق مذہب وملت سب کے ادب پاروں کو جگہ دی جاتی ہے تاکہ اردو ادب کی زیادہ سے زیادہ خدمت ہو سکے۔ کوشش کی جاتی ہے نئے شعراء کو بھی حوصلہ افزائی کے لئے جگہ دی جائے۔ اور یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر صنف کو مقام اور جگہ ملے۔ یہ میگزین ایک ڈائجسٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساری دنیا میں لاکھوں قارئین تک پہنچانے میں سب دوستوں کا تعاون بھی شامل ہے۔ وٹس ایپ اور ای میلز کے علاوہ اس رسالے کو پرنٹ کر کے سارے یوکے میں اور یورپ کے ممالک میں بھی پرنٹ کروا کر بذریعہ ڈاک بھیجا جاتا ہے۔ بعض حاسدین فراخدل نہ ہونے کی وجہ سے عناد بھی ظاہر کرتے ہیں اور منفی پراپیگنڈہ کر کے اپنی حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ قندیل تو اللہ کے فضل سے جل رہی ہے اور اس کی روشنی سے دیار مغرب اور سب براعظم جگ مگ کر رہے ہیں۔ مجھے ساری دنیا سے دوستوں کے خطوط آتے رہتے ہیں جو میرے حوصلے کو مزید بلند کرنے میں مدد و معاون ہیں۔ میں اس 90 نمبر شمارے پر احباب اور معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور درخواست دعا ہے کہ خاکسار کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھا کریں۔

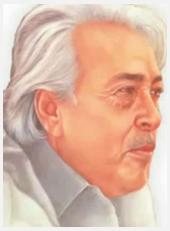

نامور شاعر ''منیرؔ نیازی صاحب

بیسویں صدی میں اردو اور پنجابی زبان کے اہم ترین شاعروں میں شمار، منفرد لب و لہجے کے نامور شاعر ''منیرؔ نیازی صاحب'' کا نام محمد منیر خاں اور تخلص منیر ہے۔ ۹/اپریل ۱۹۲۸ کو خان پور، ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں بی اے کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ مختلف اخبارات اور جرائد سے وابستہ رہے۔ فلمی نغمہ نگاری کی۔ غزل ان کی بنیادی شناخت ہے۔ پابند اور آزاد نظمیں بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں۔ نثری نظمیں بھی لکھتے تھے۔ پنجابی کے بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ وہ اردو اور پنجابی کے ۳۰ سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ اردو شاعری کے چند مجموعوں کے نام یہ ہیں: 'تیز ہوا اور تنہا پھول'، 'جنگل میں دھنک'، 'دشمنوں کے درمیان شام'، 'ماہِ منیر'، 'اس بے وفا کا شہر'، 'چھ رنگین دروازے'۔ ان کو یکجا کر کے ''کلیاتِ منیر''، 'غزلیاتِ منیر'، اور 'نظمِ منیر'، چھپ گئی ہے۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ انہیں اکادمی ادبیات پاکستان کا 'کمالِ فن' ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں حسن کارکردگی ایوارڈ کے علاوہ دو مرتبہ ستارہ امتیاز* سے بھی نوازا گیا۔ (بحوالہ: پیمانہ غزل (جلد دوم)، محمد شمس الحق، صفحہ: 221 ۔ پیشکش: اعجاز زیڈ ایچ)

مودبانہ گزارش:: قارئین سے گزارش ہے کہ دسمبر ۲۰۱۹ء سے تمام قارئین کا ماہانہ چندہ ختم ہو گیا ہے۔ فی کاپی دو پونڈ اور بذریعہ ڈاک اگر ارسال کیا جائے تو تین پونڈ بن جاتے ہیں۔ براہ کرم اس کی ادائیگی ضرور کریں۔ اس کی تیاری کمپوزنگ، ڈیزائننگ، پرنٹنگ پر کافی اخراجات ہوتے ہیں۔ اس لئے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں رقم ارسال فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ جزاکم اللہ

HSBC London UK A/C 04726979

Sort Code 400500

(M) 0044-7886-304637, 02089449385 رانا عبدالرزاق خان لندن

اُردو ہے جس کا نام

عاصی صحرائی

اپنی زبان کس کو پیاری نہیں لگتی اس بارے میں طرف داری برحق لیکن سخن فہمی بھی ضروری ہے اُردو کی زُلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔اُردو کی حسن وخوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔اس کے لطف واثر اور شیرینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا کون نہیں جانتا کہ اُردو برصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اَخذ و قبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے اور جس کا دامن رنگ برنگے پھولوں سے پُر ہے۔اور جس کی جادو اثری میں شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی تینوں کا ہاتھ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہند آریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔کون نہیں جانتا کہ جب نئی تاریخی حقیقتیں اُبھرتی ہیں۔تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے لسانی، سماجی، اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے ساجھے اور اختلاط وارتباط سے وجود میں آئی۔اس وقت اس کا کوئی نام نہ تھا۔جب کوئی بھی سچائی جنم لیتی ہے۔اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔سچائیوں کو نام اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہوجاتی ہیں۔دیوتاؤں کی دھرتی سے جب یہ نیا چشمہ پھوٹا اور اس میں عرب، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا تو اس کا کوئی نام نہ تھا۔ہندوستان کی ہر چیز ہندی تھی۔فارسی یا ئے نسبتی کے ساتھ۔اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔امیر خسروؒ نے اسے ہندی بھی کہا اور دہلوی بھی۔اسی زمانے میں جب راگ رنگ کی محافل میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجراتی بھی کہلائی۔اور پھر کسی نے اردو کہا تو کسی نے ہندی۔اور کسی نے کھڑی بنیاد وہی مگر راہیں الگ الگ ہوگئیں۔نام سے کیا ہوتا ہے لیکن یہاں نام ہی سے فاصلے بڑھے اور دوریاں بڑھیں۔اس امر کو تسلیم کرنے میں شاید کسی کو تامّل ہو کہ اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ایسی کمائی کہ جس سے کوئی انصاف پسند نظریں نہیں چرا سکتا۔تاریخ کے سیل میں جب تہذیبیں بہہ جاتی ہیں اور نسلیں پگھل جاتی ہیں۔جب چہرے کے نقوش، پہناوا، رہن سہن، طور طریقے نئی شادیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔جب گل وبلبل کا رشتہ نئی رنگینیوں کی خبر دیتا ہے جب کوئل کوکتی اور آم کے پیڑوں پر بُور آتا ہے جب دلوں کے دروازے وا ہوتے ہیں فصل کے فاصلے ڈھل جاتے ہیں۔اور وصال کے در کھلتے ہیں ایسے میں زبان قوموں اور نسلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔اور محبت ویگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔تاریخ کے ایسے لمحات میں جب تہذیب کی ہوا میں نشے کی تاثیر اور لطافت مزید پیدا ہوجاتا ہے۔تو محبت کے دو بول سنانے اور قلب وروح کو سرشار کرنے کے لئے کوئی اردو زبان پیدا ہوتی ہے۔

اردو کو محض اردو کہنا اسے صرف ایک زبان کہنا اس کی درجہ مندی کرنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں پوری ہندوستانی تہذیب اور ہزار سالہ تاریخ باہمی میل ملاپ اور برصغیر کے خوابوں، امنگوں، امیدوں، ولولوں کی توہین بھی ہے۔اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا سلیقہ اور بولنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔اردو محض زبان نہیں ایک طرز زندگی، اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے۔اور وہ شکل دی ہے جیسے آج ہم اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔درباروں سے اردو کا رشتہ بڑا معنی خیز ہے اردو نے درباروں سے نہیں بلکہ خود درباروں نے اردو سے رشتہ پیدا کیا اردو بازاروں، گلیوں، کوچوں، میلوں، ٹھیلوں، جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء کی زبان ہے۔انہی جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء نے اسے قریہ قریہ، شہر شہر پھیلایا۔

اور سورج کی کرنوں کی طرح یہ جہاں جہاں پہنچی آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب کرتی چلے گئی۔اس کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی، وسیع النظری اور محبت اور یگانگت کا وہ تصور رہا۔جس سے قومیں عروج پاتی ہیں۔اور تاریخ میں ان کے نقوش جگمگاتے رہتے ہیں۔یہی وہ زبان ہے جس میں جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء، اولیا، نے توحید کے ترانے گائے۔خواجہ معین الدین چشتیؒ ہوں یا حضرت فرید الدین گنج شکرؒ یا حضرت نظام الدین اولیاؒ ہوں یا خواجہ بندنواز گیسودراز، رامانند ہو یا تسکا رام کبیر ہو یا گرونانک سینکڑوں جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء نے اس زبان کے سر پر شفقت اور دعاؤں کا ہاتھ رکھا۔

غزلیات

نعت رسول مقبولؐ

محمد اسحاق عاجز

میرے آقا میرے سلطان مدینے والے
میرا دل اور میری جان مدینے والے
خوش نصیبی ہو جو مل جائے سعادت آقا
تجھ پہ ہو جاؤں میں قربان مدینے
مشعل راہ بنے سارے ہی عالم کے لئے
تیرا اُسوہ تیرا فرقان مدینے والے
لوٹ کے جاؤں گا خالی نہ تیرے در سے میں
بھر دے جھولی تو میری جان مدینے والے
ایک ہو نگہِ کرم میری بھی جانب آقا
مشکلیں میری ہوں آسان مدینے والے
خود بخود ہونے لگے فیض کے بھی ساماں پیارے
جب سے تھاما تیرا دامان مدینے والے
حشر کے روز جو مل جائے شفاعت تیری
تیرا عاجزؔ پہ ہو احسان مدینے والے

نعت

ساجد محمود رانا

اے شاہِ اُمم شان کے امکان برابر
لکھتا بھی کوئی کیسے مگر شان برابر
خواہش ہے بیاں کرتا رہوں آپؐ کی مدحت
ہو جائے زباں حضرتِ حسان برابر
سو جان کروں آپ کے میں نام پہ قرباں
سو جان مرے پاس ہو اک جان برابر
محشر ہی نہیں آپؐ کی الفت کی بدولت
ملتی ہے زمانے میں بھی پہچان برابر
اے کاش مجھے آئے جو اُس در پہ بُلاوا
ہوتے ہیں جہاں عامی و سلطان برابر
خوش بخت زمانے میں کہاں مجھ سا ہو کوئی
رُتبہ ہو اگر آپ کے دربان برابر
کرتا رہا ساجدؔ میں خطاؤں پہ خطائیں
ہوتے رہے پر ان کے بھی احسان برابر

عاصی صحرائی

تیرے فضلوں کا کیا شمار کروں
حمد کروں تیری اور بار بار کروں
تجھے دیکھا ہے دل کے کعبے میں
اب ترا کیا ذکر انوار کروں
میں تری بندہ پروری کا معترف
میں آدمی ہوں ترا شکر لاکھ بارکروں
عاصیؔ وہ تو حیی و قیوم مولا ہے
اس کے بندوں سے کیوں نہ پیار کروں

اقبال شیدائی

نعت رسولِ اکرم ﷺ

روزِ محشر تمام اُمّت کا
وہؐ شرف پائیں گے شفاعت کا
ہے وسیلہ ہماری برأت کا
قلب شیدا ہے اُنؐ کی مدحت کا
وصف ہے یہ رسولِ رحمتؐ کا
”ہر عمل معجزہ ہے حضرتؐ کا“
وہ ہی مومن دھنی ہے قسمت کا
سایہ جس پر ہے اُنؐ کی رحمت کا
آ گیا ہوں میں اُنؐ کے کوچے میں
اوج پر ہے ستارہ قسمت کا
خاتم المرسلیں ہیں وہ اُنؐ پر
ختم ہے سلسلہ نبوتؐ کا
وہ ہیں طاہر، مطہّر و محمود
ہیں وہ شہکار دستِ قدرت کا
اُنؐ کے اُسوہ سے ہٹ کے اب اُمّت
دَور دیکھے ہے اپنی ذلّت کا
پا گیا وہ فلاح شیدائیؔ
جو ہوا پیرو اُنؐ کی سُنّت کا
وہ ہیں اُمّی لقب پہ شیدائیؔ
ختم اُنؐ پر ہے حق فصاحت کا

محمد اسحٰق عاجز

اَج غماں دا نئیں شمار مولا
ہر پاسے ہے آہ و پکار مولا
تیری رحمتاں دا میں متلاشی
کر اپنا کرم بیشمار مولا
کارے دنیا دے نے بےسود ہوئے
تیرے رحم دا ہے انتظار مولا
پیا معافی گناہاں دی منگدا ہاں
سجدے پے کے میں گناہ گار مولا
اج گلیاں نے ہوئیاں سب سنجیاں
اتے اجڑ گئے گلی بازار مولا
مینہ رحمتاں دا برسا اپنا
کر دنیا گل و گلزار مولا
رو رو کے اتھرو سک گئے نے

اج ہر کوئی دلفگار مولا
سیں زخم تے سن فریاد میری
اسحاق عاجزؔ ہے زاروزار مولا

فیضان فیضی

حرفِ اُلفت بھی تو اک حرفِ دُعا ہے،لیکن
یعنی اک ہاتھ مری سمت بڑھا ہے، لیکن
چشم در چشم یہاں درد سفر کرتا ہے
شہرِ نم بستہ میں کچھ ایسی فضا ہے لیکن
اب چراغوں کی مدد گار بنی ہے تو بنے
مجھے آندھی سے بہر حال گلہ ہے لیکن
اب وہی لوگ سمجھتے ہیں خدا خود کو یہاں
جن کو معلوم ہے بس ایک خدا ہے لیکن
وہ تو شانے پہ اُجالوں کو لیے پھرتا ہے
اور مرے گھر میں فقط ایک دیا ہے، لیکن
مصرعہِ عشق سلیقے سے مجھے کہنا پڑا
ورنہ ہر شخص ہی کچھ بول رہا ہے لیکن

ندیم ملک

ویسے تو میرے ہاتھ میں چھالے نہیں رہے
جو درد مَیں نے رات کو پالے نہیں رہے
کچھ دن رہے حواس پہ بھاری وہ دفعتاً
کچھ دن کے بعد مَیں نے نکالے نہیں رہے
تب آرزو ہوئی کہ غبارے خرید لوں
جب موم بتّیوں میں اُجالے نہیں رہے
حد سے گزر گئی تھی انا مار دی گئی
تھے لب پہ جتنے خشک نوالے نہیں رہے
رکھّی ہے دیگچی ابھی دکھ درد کی ندیمؔ
ماں نے دیئے تھے جتنے حوالے نہیں رہے

فرزانہ فرحت لندن

اشکوں میں ڈھلا پر یہ زباں تک نہیں آیا
ورنہ تو یہ طوفان کہاں تک نہیں آیا
دنیا نے بہت کچھ ہے لکھا اہلِ جنوں پر
لیکن کوئی الزام یہاں تک نہیں آیا
جب تیرا عدو تیرے نشا نے پہ کھڑا تھا
اچھا ہے ترا تیر کماں تک نہیں آیا
وہ عشق کی آتش تھی کہ جلتا رہا یہ جسم
شعلوں کا دھواں دل کے مکاں تک نہیں آیا
وہ میرے تعاقب میں تو آتا رہا برسوں
میں آج جہاں ہوں وہ وہاں تک نہیں آیا
رکھتا ہے مرے دل کے خرابوں کو جو آباد
نام اس کا کبھی میری زباں تک نہیں آیا
دل میں مرے کچھ وہم بھی آتے رہے فرحتؔ
پر اُس سے بچھڑنے کا گماں تک نہیں آیا

اعظم نوید

کسے اب دوستی کہیئے ، کسے اب دشمنی کہیئے
نہ ہو دل میں اگر اُلفت تو پھر مُردہ دلی کہیئے
دکھاوے کی عبادت کام آتی ہے نہ آئے گی
جو ہو خوفِ خدا دل میں تو اس کو بندگی کہیئے
عجب بھونچال آیا ہے حکومت کے بھی ایواں میں
گرے ہیں سر کے بل کتنے خدا کی قاہری کہیئے
جسے دیکھو وہ درباری بنا پھرتا ہے شاہوں کا
کرے حق بات جو کوئی اسے بندہ جری کہیئے
کسی کو سامنے پاکر بظاہر مسکراتے ہیں
جو چہرے سے ہویدا ہو اسے دل کی خوشی کہیئے
بہت سے لوگ اب لفظوں کی تُک بندی کے ماہر ہیں
اثر دل پر کرے کوئی تو اسکو شاعری کہیئے
عجب دورِ تفاخر ہے یہاں پر جاری و ساری
ارے صاحب یہاں کس سے یہ دل کی راگنی کہیئے
سبھی سچی کھری کہتے ہوئے ڈرتے ہیں حاکم سے
کہاں اب گفتنی کہیئے، کہاں نا گفتنی کہیئے
کسی کو کیا ہوا حاصل فقیروں کو ستانے سے
خدا کا قہر جب بھڑکا لُٹی سب ساحری کہیئے
وفا کی راہ میں چاہے ستم ہو یا کرم یارو
حسیں چاہت کو ہر صورت بہارِ زندگی کہیئے
کسی کی چاہ میں اپنا سبھی کچھ ہم گنوا بیٹھے
ذرا سی بھول کو اعظمؔ ہماری سادگی کہیئے

کاشف نسیم سیالکوٹ

یہ دنیا مری کیا سے کیا ہوگئی
اک دوجے سے ملنا وبا ہوگئی
تکبر تھا جس کو ترقی کا دوست
پل بھر میں لیکن فنا ہوگئی
سمجھے تھے جس کو جواں سال ہے
اسی زندگی پہ قضا ہوگئی
لاشوں کے ہر سو ہی انبار ہیں
سبھی سے ہی قسمت خفا ہوگئی
بندے اے مولا پشیمان ہیں
کریں معاف ان سے خطا ہوگئی
تری ہی یہ حمد و ثنا کر رہے
کریں دور آفت جفا ہوگئی
پیچھے پڑی ہے یہ سب کت وبا
کورونا سے دنیا فنا گئی
سوالی طلبگار در کے ترے
جو ''کُن'' تُو کہے تو شفا ہوگئی

ڈاکٹر فیاض احمد علیگ

میں ہارا بھی اگر تو دوستی میں
وگرنہ کون جیتا دشمنی میں
ترا ظالم کوئی نام و نسب ہے
تجھے ڈھونڈے گا کوئی کس گلی میں۔
مصیبت میں نہیں کوئی کسی کا
زمانہ ساتھ ہوتا ہے خوشی میں
غزل محبوب سی نازک تھی پہلے
مگر نشتر ہوئی اب کی صدی میں
بھری برسات میں جو یار بچھڑے
کہاں پھر لطف کوئی زندگی میں
مرے رستے میں دنیا آگئی تھی
اسے بھی روند آیا بے خودی میں
ذرا سی بات پر یوں روٹھ جانا
مناسب تو نہیں ہے دوستی میں
سمندر اپنی موجوں سے پریشاں
سلگتی آنکھ ہے اپنی نمی میں
مری فریاد بھی فیاضؔ اکثر
وہ ظالم ٹال دیتا ہے ہنسی میں

جمشید مسرور

تم انتظارِ باد بہاری نہ کم کرو
آنسو ہیں سوکھ جائیں گے ان کا نہ غم کرو
اُس یاسمیں بدن سے لپٹ کر نہ جو کہیں
اب ان حکائتوں کو ہوا پر رقم کرو
پازیب بولتی رہے جنگل میں مور بھی
رقاصہ آؤ رقص میں اے آہو رم کرو
آرائشِ جمال ہے گلگشت دلبراں
اس سیرِ باغ کیلئے ساماں بہم کرو
سوداگرانِ مرگ نے منڈی اُجاڑ دی
تم کاروبارِ زیست خُدا کی قسم کرو
جمشیدؔ منتروں میں تمہیں بھی تو درک ہے
سب نازنیں علیل ہیں اب تم ہی دم کرو

اطہر حفیظ فراز

وہ نہ گر ٹالتا بلاؤں کو،
چین آتا کہاں دعاؤں کو،
دور شہروں سے روز بھاگے گا،
تو اگر دیکھ لے جو گاؤں کو
ایک نسخہ نہ بن سکا اب تک،
کون پوجے گا ان خداؤں کو
تو نے ظالم!! خدا بھلا ڈالا،
کیوں نہ کوسوں تیری اداؤں کو
ایک آواز کے بھروسے پہ،
ہم نے چیرا ہے ان خلاؤں کو
لفظ بن کر دعا نکلتے ہیں،
''لطف کر، بخش دے خطاؤں کو''
رحم کر دے تو آج خلقت پر،
رحم آتا ہے جیسے ماؤں کو
میری بستی یوں جگمگا اٹھے،
حکم دے دے سبھی شعاعوں کو
گر خدا کو فراز !! پانا ہے،
بھول جاؤ سبھی اناؤں کو

وہاب

اپنے گھر کے در و دیوار سے ڈر لگتا ہے
گھر کے باہر تیرے گلزار سے ڈر لگتا ہے
فاصلے بن گئے تکمیلِ محبت کا سبب
وصلِ جاناں سے رُخِ یار سے ڈر لگتا ہے
اُسکی یادوں سے ہی تسکین تصور کرلوں
اب مجھے محفلِ دلدار سے ڈر لگتا ہے
سارے تبدیل ہوئے مہر و وفا کے دستور
چاہنے والوں کے اب پیار سے ڈر لگتا ہے
خوشبوؤں لذتوں رنگوں میں خوف پنہاں ہے
برگ سے پھول سے اشجار سے ڈر لگتا ہے
تھی کسی طور علیلوں کی عیادت واجب
لیکن اب قربتِ بیمار سے ڈر لگتا ہے
جنکی آمد کو سمجھتے تھے خدا کی رحمت
ایسے مہمانوں کے آثار سے ڈر لگتا ہے
اب تو لگتا ہے مِرا ہاتھ بھی اپنا نہ رہا
اس لئے ہاتھ کی تلوار سے ڈر لگتا ہے
تن کے کپڑے بھی عدو پیر کے جوتے دشمن
سر پہ پہنے ہوئی دَستار سے ڈر لگتا ہے
جو گلے مل لے میری جان کا دشمن ٹھہرے
اب ہر اک یارِ وفادار سے ڈر لگتا ہے
ایک نادیدہ سی ہستی نے جھنجوڑا ایسے
خلق کو گنبد و مینار سے ڈر لگتا ہے
بن کے ماجوج نمودار ہوا چاروں جانب
اِسکی یاجوج سی رفتار سے ڈر لگتا ہے
عین ممکن ہے یہاں سب ہوں کورونا آلود
شہر کے کوچہ و بازار سے ڈر لگتا ہے
خوف آتا ہے صحیفوں کی تلاوت سے اب
ہر رسالے سے ہر اخبار سے ڈر لگتا ہے
اب تو اپنوں سے مصافحہ بھی ہے پُرخطر وہابؔ
یوں نہیں ہے کہ فقط اغیار سے ڈر لگتا ہے

انور ندیم علوی

کُو بکُو بات چلی بات انوکھی کردی
ایک حسینہ نے ہے مجنوں کی ٹھکائی کردی
وہ کراٹے کی تھی ماہر اسے معلوم نہ تھا
ناک بھی زخمی تو غائب ہے بتیسی کردی
کوئی خوشبو کی طرح آج گلے سے لپٹا
عید ملتے ہی مگر جیب بھی خالی کردی
مجھ پہ گزری ہے شبِ وصل قیامت بن کر
اُس 'قیامت' نے ہے کچھ بات ہی ایسی کردی
بنگلہ تو بھی تو میرے نام کرادے اپنا
زندگی میں نے تیرے نام ہے ساری کردی
''کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے''
ایسا لوٹا ہے کہ بس توڑ دیا ہے اُس نے

ساجد محمود رانا

کب ترے ہجر میں بیمار نہیں کوئی بھی
کیا عیادت ہو کہ غمخوار نہیں کوئی بھی
صبر کی سولی پہ لٹکا ہے بدن مدت سے
اور ستم یہ ہے طرفدار نہیں کوئی بھی
اپنے کاندھوں پہ لیے پھرتا ہوں میں لاش اپنی
کیسے رُک جاؤں مددگار نہیں کوئی بھی
سرِ بازار تماشے کی اذیت نہ سہو
اس محبت کا طلبگار نہیں کوئی بھی
بارہا مات مقدر کی لکھی ہے شاید
ورنہ لشکر میں تو غدار نہیں کوئی بھی
سارے زنجیرِ ضرورت سے بندھے رشتے ہیں
میرا ہمدرد نہیں یار نہیں کوئی بھی
کون دروازے پہ دھر جاتا ہے دستک ساجدؔ
میں نے دیکھا ہے دِگر بار نہیں کوئی بھی

قیامت
عامرؔ حسنی ملیشیا

دن جب بھی گھیر لیں تمہیں رنج و ملال کے
رکھیو نہ دوستو کہیں آنسو سنبھال کے
اب وقت ہے کہ سجدہ گہیں تر کرو تمام
سجدوں میں گِر کے پیش کرو، دل نکال کے
ہر آن ایک رنگِ قیامت ہے الامان
دن آئیں مولا زخموں کے پھر اندمال کے
اک سانس تو نہ لے سکے اذنِ خدا کے بِن
انبار بھی ہوں گر ترے مال و منال کے
معمولی وائرس (virus) نے کیا سب جہاں کو قید
باندھے ہوں پاؤں جیسے کسی نونہال کے
جھک جاؤ عاجزی سے سمجھ لو کہ ہیچ ہے
کبر و غرور سامنے اُس ذوالجلال کے
پیشانیاں ہوں خاک میں خوفِ خدا کے ساتھ
کینوں سے پاک، نرم خو، دل ہوں کمال کے
وہ رنگ ہوں اَحد کے، اَحد کی ہی تان ہو
جیسے بلند بانگ تھے نعرے بلال کے
اشکوں سے اب وضو کیے عامر ہے ملتجی
آئیں نہ اس کے بعد کبھی دن وبال کے

انتخاب
لیاقتؔ جعفری

عجیب لوگ تھے وہ تتلیاں بناتے تھے
سمندروں کے لیے مچھلیاں بناتے تھے
مرے قبیلے میں تعلیم کا رواج نہ تھا
مرے بزرگ مگر تختیاں بناتے تھے
وہی بناتے تھے لوہے کو توڑ کر تالا
پھر اُس کے بعد وہی چابیاں بناتے تھے
فضول وقت میں وہ سارے شیشہ گر مل کر
سہاگنوں کے لیے چوڑیاں بناتے تھے
ہمارے گاؤں میں دو چار ہندو درزی تھے
نمازیوں کیلئے ٹوپیاں بناتے تھے

ثمینہ رحمت منال

گٹھری میں کیا ہے تم کو بتایا نہ جائے گا
یہ بوجھ تم سے سر پہ اٹھایا نہ جائے گا
ہنستے ہوؤں کو اور ہنسایا نہ جائے گا
روتے ہوؤں کو اور رلایا نہ جائے گا
گرچہ وہاں پہ میرا کچھ ساماں ہے قیمتی
جلتے ہوئے مکان میں جایا نہ جائے گا
شدت کی پیاس بھی ہے اور تیز بھوک بھی
مجھ سے تو آج روزہ نبھایا نہ جائے گا
چناؤ ہو چکا ہے شہر ووٹ دے چکا
جیتے ہوؤں کو اب تو ہرایا نہ جائے گا
بازار بند ہیں کوئی گاہک نہیں کہیں
اس شہر میں تو رزق کمایا نہ جائے گا
تم نے وفا کے نام پہ تہمت لگائی ہے
تم سے وفا کا گیت سنایا نہ جائے گا
یہ رب ہی ہے جو روز بناتا ہے چاک پر
تم سے تو اک بشر بھی بنایا نہ جائے گا
بیٹے کے باپ سے کہا بیٹی کے باپ نے
تم سے تو میرا درد بٹایا نہ جائے گا

نعتِ رسول اکرم ﷺ
طاہر سعود کرتپوری

ربّا معاف، برف کو ہم جل نہ کر سکے
حبِ نبی میں آنکھ کو بادل نہ کر سکے
عاشق کہاں ہے، وہ جو محمدؐ کے نام پر
جنگل کو شہر، شہر کو جنگل نہ کر سکے
حق ہی نہیں ہے اسکو کہ لکھے وہ نعت پاک
وہ گفتگو قلم جو مدلّل نہ کر سکے
ہر چند کوششیں کیں، ستم گارِ وقت نے
بوئے حضور پھر بھی مقفّل نہ کر سکے
لکھ لکھ کے، ٹوٹ ٹوٹ گئے، سیکڑوں قلم!
تشریحِ روئے آپؐ، مکمل نہ کر سکے
صلے علیٰ کا نور ہے سینے میں اس لئے
مردود میرے قلب کو کاجل نہ کر سکے
واللہ کیا معجزہ معراج ہے سعودؔ
روح الامین تک بھی جسے حل نہ کر سکے

طارق تاسی

قربتوں میں فاصلے، کس واسطے
رد ہوئے سب واسطے، کس واسطے
بے بصیرت پتھروں کے درمیاں
ایستادہ آئینے، کس واسطے
جانتے بھی ہو کہ منزل ایک ہے
پھر جدا ہیں راستے، کس واسطے

درد دل میں پہلے ہی کچھ کم نہیں
دے رہے ہو دوسرے، کس واسطے
م پسِ پردہ رہو، لو جان لو
آ رہے ہو سامنے کس واسطے
رف کوئی غیر اہم جب نہیں
ہر ورق پر حاشیے، کس واسطے
آمدِ شب کا یقیں بھی ہے مگر
دے دیے اتنے دیے کس واسطے
امزن سوئے زمیں اے آسماں
ہیں مسلسل حادثے، کس واسطے
دے کے تاسّی ہم کو اذنِ راستی
پھر بھلا یہ دائرے، کس واسطے

چوہدری سر ظفر اللہ خاں کی وفات پر عبدالکریم قدسی کا نظرانہ عقیدت

اس جیسا بے لوث مسافر کب آئے گا
رَختِ سفر تھا جس کا آنسو اور دعائیں
اے اہلِ وطن مجھ کو بھلانا نہیں آسان
اس عہد کی پیشانی پر لکھا ہے میرا نام
تو نے اقوامِ اقوام میں سب سے پہلے
اپنے لہو سے لکھا پاکستان کا نام
یہ دور تجھے لاکھ بھلائے بھی تو کیا ہے
تاریخ یہ تجھے ہر طور یاد رکھے گی
جب قیدِ تعصب سے رہا ہوگا زمانہ
ابنائے چمن! ہم کو بہت یاد کروگے
اس کے پہلو میں محبت ہی محبت تھی نہاں
اک گھنا برگد تھا ایسا جس کا سایہ تھا گھنا
چل بسا ہے اے وطن تیرا بطل جلیل
جو کڑے وقتوں میں تیرے کام آیا تھا بہت
عظمت پاک سر زمیں کے لئے
وقف کی اپنی زندگی تو نے
چار سُو پھیلتے اندھیروں کو
چیر کر کی ہے روشنی تو نے
جا بجا راستوں پہ چھوڑے ہیں
ان گنت معتبر نشاں تو نے
منزلوں کے قریب پہنچایا
ملک و ملت کا کارواں تو نے

نثار ناسک

اس سے پہلے کہ مجھے وقت علیحدہ رکھ دے
میرے ہونٹوں پہ مرے نام کا بوسہ رکھ دے
حلق سے اب تو اترتا نہیں اشکوں کا نمک
اب کسی اور کی گردن پہ یہ دنیا رکھ دے
روشنی اپنی شباہت ہی بھلا دے نہ کہیں
اپنے سورج کے سرہانے مرا سایہ رکھ دے
تو کہاں لے کے پھرے گی مری تقدیر کا بوجھ
میری پلکوں پہ شبِ ہجر یہ تارا رکھ دے
مجھ سے لے لے مرے قسطوں پہ خریدے ہوئے دن
میرے لمحے میں مرا سارا زمانہ رکھ دے
ہم جو چلتے ہیں تو خود بنتا چلا جاتا ہے
لاکھ مٹی میں چھپا کر کوئی رستہ رکھ دے
ہم کو آزادی ملی بھی تو کچھ ایسے ناسکؔ
جیسے کمرے سے کوئی صحن میں پنجرہ رکھ دے

ماہِ رمضان
امجد رسُول امجد

ستّر ماواں دے نالوں پیارا پیار بنایا
رب نے ایویں نہیں ماہ رمضان بنایا
اُس فرمایا جدی شان نرالی اے یارو
جدے موڈے تے کملی کالی اے یارو
ربّ شیطان نوں جیل اِچ بند کریندا
توبہ گنہگاراں دی بڑی پسند کریندا
سینے ابلیس دے چلدی اے ریل لوکو
جدوں لگ جائے نیکیاں دی سیل لوکو
نفل فرضاں دے نیڑے ہو جاندے نیں
فرض ستر گنا ودھیرے ہو جاندے نیں
رحمت والا دریا کنارے توڑ دیوے
اِس مہینے شرابی وی شراباں چھوڑ دیوے
اِس مہینے چوری چکاری تے جی نہیں کر دا
کسے بُرے دی یاری تے جی نہیں کر دا
نافرمانی کرکے جینا عجیب لگے
لُک کے پانی وی پینا عجیب لگے
امجدؔ کہندا اے ساڈا ایمان بنا دے ربا
سارا سال ماہ رمضان بنا دے ربا

ڈاکٹر افتخار احمد ایاز

احمدیت کی بلندی کا دن آیا دیکھ لو
وقتِ سجدہ سحر سے پہلے کا نقشہ دیکھ لو
آسماں کے رنگ کو تم بھی بدلتا دیکھ لو
خود خدا نے ہاتھ سے پودا لگایا دیکھ لو
پھیلتا ہے سب جہاں میں اس کا سایہ دیکھ لو
دیکھ لو مظلوم پر ہی فضل کی برسات ہے
ظالموں نے ظلم کا جو پھل ہے پایا دیکھ لو
ہم بلاتے ہیں تمہیں ہر کامیابی کی طرف
کامیابی کی ضمانت ہے منارہ دکھ لو
آنے والے نور کے طوفان کو روکے گا کون
پرچمِ حق آسماں پر لہلہاتے دیکھ لو
خوف کا موسم گیا اب آنکھ کھولو افتخارؔ
احمدیت کی بلندی کا دن آیا دیکھ لو

عبدالکریم قدسی

منبر پر کھڑا ہو کہ وہ بیٹھا نظر آئے
ہر حال میں اِک چاند چمکتا نظر آئے
اِک بار جو دیکھے وہ محبت کی نظر سے
ماحول پر اِک نور برستا نظر آئے
ہم اپنی تمناؤں کے آشاؤں کے بیمار
جب دیکھیں اسے ہم کو وہ اچھا نظر آئے
تھوڑی سی مشقت سے بدن ٹوٹے ہے اپنا
وہ سب کا مگر بوجھ اٹھاتا نظر آئے
اس کی ہی دعا سے میرا ایماں ہے مکمل

یوں وہ میرے ایمان کا حصہ نظر آئے
وہ بولے تو الفاظ کا اِک شہد مِلا دودھ
اِک شان سے رگ رگ میں اترتا نظر آئے
اِک ذات سے وابستہ دل و جاں کی ہے رونق
وہ جب بھی نظر آئے ہمیں جلسہ نظر آئے

تیرگی - عاصی صحرائی

ہے قیامت کا اندھیرا اور محشر تیرگی
جل گیا سارا جہاں پہنچی ہے گھر گھر تیرگی
چار سُو ہے کُفر کی تیرگی آتی نظر
شرک ہے، الحاد ہے، اور ہے یہی شر تیرگی
ہے پرستش مادیّت کی، چہار جانب ہے یہی
روشنی دیکھی جہاں اب اُس ہی در پر تیرگی
ناخدا سب معبدوں کے ہر جگہ مدہوش ہیں
اُن کے جذبوں میں اُتر آئی سراسر تیرگی
ہے عجم بھی اور عرب بھی نور کو ترسے ہوئے
نور آتا ہے تو کہتے ہیں کہ بہتر تیرگی
رات بھر طیور تلاشِ روشنی کرتے رہے
ہو گئی سورج کے آنے سے منور تیرگی
ہے زمین و آسماں میں نور سب اللہ کا
اس سے مٹتی ہے زمانے میں برابر تیرگی
نور کی قندیل لے کر پیر عاصیؔ آگئے
اب تو بھاگی جارہی ہے جو تھی اندر تیرگی

ہو نہ ہو (کورونا کے حوالے سے)
نیاز جبر اجپوری

ہر طرف دُنیا میں افرا تفری ہاہا کار ہے
سبکو کووِڈ نائنٹین نے کر رکھا دو چار ہے
ہے کورونا وائرس کا خوف طاری ہر طرف
آہ ! دہشت فکر اُلجھن بیقراری ہر طرف
مُبتلا فکر و تردُّد میں ہُوئے جاتے ہیں لوگ
بے بس و مجبور اپنے آپ کو پاتے ہیں لوگ
چھینک یا آ جائے کھانسی تو لرز جاتے ہیں لوگ
ہاتھ آپس میں مِلانے سے بھی کتراتے ہیں لوگ
دُوری مِلنے جُلنے والوں سے ضروری ہو گئی
جو بہت نزدیک تھے اُن سے بھی دُوری ہو گئی
ہاتھ صابن اور بہتے پانی سے دھونے لگے
آ پڑی اُفتاد تو محتاط اب ہونے لگے
گھر کے اندر لوگ مجبوراً ہُوئے محصور ہیں
غم زدہ مایوس خائف مضمحِل مجبور ہیں
ہے مُصیبت کی گھڑی یہ دیش دُنیا کے لئے
آسماں نے دھرتی سے کِس رُوپ میں بدلے لئے
روز و شب کا اِحتساب اب تو ضروری ہو گیا
زیست کا لُبِّ لباب اب تو ضروری ہو گیا
ہو نہ ہو یہ آزمائش ہے سبق ہے اِمتحان
کچھ نہ کچھ تو ہے جو مُشکِل میں پڑی جائے ہے جان
باعثِ تشویش یہ جو گردشِ حالات ہے
جیسی کرنی ویسی بھرنی والی لگتی بات ہے
سرکشی ظُلم و سِتم بے رہ روئی بڑھ جائے جب
غیر ممکن ہے کہ قدرت کو جلال آئے نہ تب
جب زمیں پر بے حیائی ، بدگوئی بڑھ جاتی ہے
آسماں سے تب بلا کوئی زمیں پر آتی ہے
ہر عذاب و قہر سے اللہ سے مانگیں پناہ
نادِم و شرمندہ ہوں اُس پر ہُوئے جو بھی گُناہ
آج کل پرسوں بھی ایسا ، بلکہ ایسا ہی کریں
توبہ استغفار سے اللہ کو راضی کریں
اے مِرے اللہ میرے رب مِرے بھگوان کر
زِندگی جو تُو نے دی جینا اسے آسان کر
مالکِ ارض و سما سے اِلتجا کرتے ہوئے
اے نیازؔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہُوئے

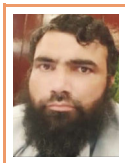

رمضان المبارک کی آمد پر
کامران اعظم سوہدروی

بن کے رہ جاتا ہے، دل میں ہر گھڑی مثلِ سرور
فقر ہے، ترا اگر عالم میں تصویرِ غیور
رہ نہیں سکتا کبھی، آئینِ فطرت، بے حجاب
قلب ہو، بے تاب تر، چشمِ ہستی بے صبور
فقر کیا ہے؟ اشتیاقِ رنج و غم کی داستاں
فقر کیا ہے؟ روبرو ہوتے ہیں غیوب و حضور
حادثات پیہم ہے یہ سلسلہ ہائے نفس
آہ! شعار زیر و بم میں زندگانی کا شعور
صورتِ بسمل تجھے رکھتی ہے، تدبیرِ حیات
حلقۂ تقدیر کو، لیکن نہیں کرتی عبور
قافلۂ ذوق ہے، پیہم، رواں، محوِ خرام
جذب و مستی ہر گھڑی دیتی ہے ترغیبِ وفور
راز ہوتا ہے، فقط، اہلِ فقر پہ آشکار
سوز و سازِ دل اگر پیدا کرے، جاں میں سرور

ثمینہ رحمت منال

محبت کی سزا کافی نہیں ہے
مجھے یہ آسرا کافی نہیں ہے
مجھے منزل بھی دو زادِ سفر بھی
مجھے اک راستہ کافی نہیں ہے
ہوائے تیز بھی خواہش ہے میری
مجھے جلتا دیا کافی نہیں ہے
یہاں کے لوگ منتر جانتے ہیں
یہاں اک شعبدہ کافی نہیں ہے
اپنے ساتھ لاؤ منّ و سلویٰ
فقط اک معجزہ کافی نہیں ہے
فرائض اور بھی کچھ ہیں سفر کے
نمازوں کی قضا کافی نہیں ہے
یہی تھا شور ایوانوں کے باہر
یہ اندازِ سخا کافی نہیں ہے
خوشی پہ میرا بھی تو کوئی حق ہو
ترا دکھ ہی پیا کافی نہیں ہے
وہ ڈوبے سب فریبِ ناخدا میں

جو کہتے تھے خدا کافی نہیں ہے
مِری نیکی کا بھی کچھ تو صلہ ہو
گناہوں پہ عطا کافی نہیں ہے
مجھے ہے غرض پوری داستاں سے
مجھے اک واقعہ کافی نہیں ہے
ثمینہؔ ڈوبتی کشتی کو تیری
ہواؤں کی دعا کافی نہیں ہے

امین اوڈیرائی

وہاں کچھ ہے نظر کچھ آ رہا ہے
کہ سارا شہر دھوکا کھا رہا ہے
سرابوں کا سمندر ہے وہ یارو!
ہر اک پیاسا جدھر کو جا رہا ہے
مسلسل دھوپ بڑھتی جارہی ہے
فلک بھی آگ اب برسا رہا ہے
خوداپنی لاش کاندھوں پر اٹھا کر
یہاں ہر شخص چلتا جا رہا ہے

رشید احمد رشید بیدر کرناٹک

جو دل فدائے احمدِ مرسلؐ نہ ہو سکا
وہ بد نصیب صاحبِ منزل نہ ہو سکا
نورِ نبی سے قبل تو خود ربِّ ذوالجلال
تخلیقِ کائنات کے قابل نہ ہو سکا
کیا شئے ہے جلوہء رخِ احمد خدا کی شان
سورج چھپا تو چاند مقابل نہ ہو سکا
جب تک لاالہ نہ محمدؐ سے جڑ گیا
کلمہ خدا کے نام کا کامل نہ ہو سکا
اس شان کا بشر کوئی آیا نہ آج تک
کوئی خدا کے راز کا حامل نہ ہو سکا
کس کی نظر کو تابِ جمالِ الوہیّت
کوئی خدا کی دید کے قابل نہ ہوسکا
تھی دید باز دید کی اک شان عرش پر
وہ حُسن تھا کہ عشق مقابل نہ ہو سکا
اے نورِ اولیں ترے قرباں یہ کائنات
درجہ کسی بشر کو یہ حاصل نہ ہو سکا
انصاف وعدل وجود وسخاوت ہے تجھ پہ ختم
تجھ جیسا کوئی منصف وعادل نہ ہو سکا
جلوہ فگن جمالِ محمدؐ اگر نہ ہو
پتھر ہے وہ خدا کی قسم دل نہ ہو سکا
بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر
سایہ ترا حریفِ مقابل نہ ہو سکا
نعتِ نبی ہوئی ہے رقم اس خلوص سے
وسواس کوئی ذہن میں شامل نہ ہو سکا
میں مانگ لوں خدا کو رسولِ کریم سے
مجھ سا رشیدؔ پھر کوئی سائل نہ ہو سکا

امجد رسول امجد

ربا مٹی نال بنانا نہیں سی
فیر مٹی وچ ملانا نہیں سی
ساہ جے آخر کڈ لینا سی
پہلے دن ای پانا نہیں سی
جے کر دانا دانا گن لینا سی
فیر لاڈاں نال کھوانا نہیں سی
میں جے سب تو اعلیٰ ساں
جنتوں فیر کڈھانا نہیں سی
کتھے میں ساں، کتھے اوہ سی
ابلیس نال ٹکرانا نہیں سی
مرضی نال جے آندا امجدؔ
فیر تے ایتھے آنا نہیں سی

کافر بنا دیا

رانا محمد حسن خاں

اک کلمہ گو کو تم نے کافر بنا دیا
تم نے تو دین ملاں کا ڈنکا بجا دیا
اک وقت آئے گا کہ ہونگے سب ہی کافراں
تم نے تو کا ر خانہ ھی اس کا لگا دیا
ملاں تیرے کر دار نے کیا گل کھلا دیا
امت کو تیرے فتنہ نے باہم لڑ ا دیا
مذہب کے نام پر کیا انسانیت کا خون
فتوے ترے نے ہر جگہ او دھم مچا دیا
کلمہ عز یز ھے جنہیں جاں سے عزیز تر
ان کو بھی آج ملاں نے کافر بنا دیا

آفتاب شاہ

کیا وباء آئی کہ لوگ ہنسنے ہنسانے سے گئے
راہ بدل لیتے ہیں لوگ ہاتھ ملانے سے گئے
پہلے ہرروز سرِ بازار چہل کرتے پھرتے تھے
کیا غضب مجھ کو میرے دوست ستانے سے گئے
روٹھ کر دنیا سے اب تنہائی اُوڑھ رکھی ہے
دنیا تو دنیا ہے یار! تم بھی منانے سے گئے
میرا جو ہاتھ ہے تنگ تو خوش نہیں ہے وہ بھی
غریب تو ایک طرف امیر بھی کمانے سے گئے
وہ کہاں ہیں جو خدا بن کے دوا دیا کرتے تھے
مسجدیں خالی ہوئیں مرید کیوں آستانے سے گئے
ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گئے ہیں اب کی بار
ملا مسجد سے گیا اور مے کش مے خانے سے گئے
محفلیں اُجڑ گئیں رونقیں ہو ئیں ماتم کناں
پیزا مغفور ہوا اور برگر بھی کھانے سے گئے
کوک اور پیپسی کو یہ کس کی ایسی آہ لگی
پانی شیزان بنا اورسٹنگ بھی پلانے سے گئے
دیکھ کر گھر کو ہر چیز پر شک ہوتا ہے

ڈر کرونا کا ہے ایسا کہ نہانے سے گئے
لاک ڈاؤن ایسا ہوا کہ عابدہ پروین سے بال ہوئے
کھچڑی داڑی کی بنی اور شیو کروانے سے گئے
چھینک غلطی سے جو آجائے آفتاب تو دبک جاتا ہوں
اب تو یہ بات بھی بیگم کو بتانے سے گئے

مبشر شہزاد

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا،
کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
کیا اب بھی یونہی پہلے کی طرح،
اٹھتا ہے دھواں، جلتے ہیں چمن؟
کیا اب بھی وہاں لوگوں کے دل،
مُلا کے دین سے ڈرتے ہیں؟
اور خودکش حملوں میں وحشی،
حوروں کی خاطر مرتے ہیں؟
کیا اب بھی سعودی دولت سے،
جاپانی پراڈو آتی ہے؟
اور اس میں بیٹھی بیگم کی،
ریشم کی قبا لہراتی ہے
کیا اب بھی عبادت گاہوں میں،
نفرت کی فصل ہی پھلتی ہے؟
اور اس کو کھا کر لوگوں کی،
آنکھوں سے آگ نکلتی ہے؟
کیا اب بھی وطن میں بچوں کو،
سب جھوٹ پڑھایا جاتا ہے؟
جو سچ کا طالب ہو اس کو،
اللہ سے ڈرایا جاتا ہے؟
کیا اب بھی عقل پہ پہرے ہیں،
اور انساں گونگے بہرے ہیں؟
کیا اب بھی سوچنے والوں کی،
قسمت میں صرف کٹہرے ہیں؟
کیا اب بھی جنّ کے قبضے سے،
لوگوں کو چھڑایا جاتا ہے؟
اور ایسے شعبدہ بازوں کو
ٹی وی پہ دکھایا جاتا ہے؟
کیا اب بھی وہاں کے شہروں میں،
گٹروں کا پانی بہتا ہے؟
اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر،
کچرے کا قبضہ رہتا ہے؟
کیا اب بھی کاروکاری میں،
معصوم کی جانیں جاتی ہیں؟
اور ان کی قبروں پر خلقت،
انصاف کے دیپ جلاتی ہیں؟
کیا اب بھی اندھی عقیدت کی،
لوگوں پہ حکومت جاری ہے؟
اور ان کے جینے مرنے پر،
مُلا کی اجارہ داری ہے؟
کیا شام پڑے گلیوں میں اسی،
آسیب کا ڈیرہ رہتا ہے؟
اور دل کی سونی بستی میں،
ہر وقت اندھیرا رہتا ہے؟

فرزانہ فرحت لندن

اپنا جنون اپنی اذیت چھپا کے رکھ
اب خود سے بھی تو میری محبت چھپا کے رکھ
اس کی گلی سے نرم ہوا کی طرح گزر
اس کی گلی سے جو بھی ہے نسبت چھپا کے رکھ
ہے کون دھڑکنوں میں یہ تیری چھپا ہوا
کس کی ہے تیرے دل کو ضرورت چھپا کے رکھ
کس کے لئے کیا ہے سفر یہ نہ بھید کھول
خود راستوں سے اپنی مسافت چھپا کے رکھ
تیری جگہ یہ آئینے میں کس کا عکس ہے
خود آئینے سے اپنی یہ حیرت چھپا کے رکھ
کس کی محبتوں نے تجھے در بدر کیا
تو دشت سے بھی اپنی یہ وحشت چھپا کے رکھ
اس کو گلے لگا مگر اس کی طرف نہ دیکھ
اس کی نظر سے بھی تو یہ حیرت چھپا کے رکھ
معیار پر تُو جس کے نہ پورا اتر سکے
اے دوست اپنی اُس سے ندامت چھپا کے رکھ
حاسد بہت ہے دنیا تو اس کا خیال کر
اہل جہاں سے اپنی مسرت چھپا کے رکھ
اس پر بھی بھید کھول نہ اپنی وفاؤں کا
خواہش ہے تیرے دل میں جو فرحتؔ چھپا کے رکھ

ایس۔ایم۔تقی حسین

شب کے ٹوٹے ہوئے تارو یہ بتاو مجھ کو
نیند کس راہ پہ ہے آج کی شب میرے لئے
دھڑکنیں مات ہوئیں دل مرا سونا سونا
روح بے روح بہت، کون یہاں میرے لئے

قسیم اختر

ہندوستان کورونا سے بچو

ہے یہی وقت کا فرمان کورونا سے بچو
چاہے مفلس ہو کہ سلطان کورونا سے بچو
قیمتی سب سے ہے یہ جان کورونا سے بچو
مفت میں مت ہو پریشان کورونا سے بچو
دیکھو بستی نہ ہو ویران کورونا سے بچو
اور آباد ہو شمشان کورونا سے بچو
تم بچوگے تو کورونا سے بچے گا یہ سماج
ہوگا اس دیش پہ احسان کورونا سے بچو

یہ وبا ہے کوئی یا قہر خداوندی ہے
ہو گناہوں پہ پشیمان کورونا سے بچو
اپنے ربّ سے یہ دُعا مانگو کہ ٹل جائے وبا
دل سے پڑھ لو ذرا قرآن کورونا سے بچو
اب نمازیں نہ قضا ہوں نہ تو روزے چھوٹیں
تم بنو سچے مسلمان کورونا سے بچو
اپنی طاقت پہ بہت ناز تھا دنیا میں جسے
ان کی مٹی میں ملی شان کورونا سے بچو
جن کو چڑتھی کہ حجاب اچھا نہیں ہے رخ پر
منہ چھپاتے ہیں وہ ہر آن کورونا سے بچو
چین و امریکہ بھی نرغے میں پھنسے ہیں اس کے
کانپنے لگ گیا جاپان کورونا سے بچو
جرمنی، اٹلی، کناڈا، ہو کہ اسپین، سبھی
پھنس کے بولا یہی ایران کورونا سے بچو
وائرس چین سے پھیلا ہے جو دنیا میں قسیمؔ
ہے فقط اللہ کا فرمان کورونا سے بچو

مبارک احمد عابد

ساقی آج شام پینے والے دور دور ہیں
میکدے میں مے کشوں سے پیالے دور دور ہیں
دل اگر کشادہ ہے تو ہر طرف ہیں وسعتیں
دیپ طاقچے میں ہے اُجالے دور دور ہیں
دن ہؤا اجاڑ سا تو رات بھی پہاڑ سی
بے بسی نے آج ڈیرے ڈالے دور دور ہیں
دل حویلی میں کبھی کوئی آیا نہ گیا
ہر طرف پڑے ہوئے جالے دور دور ہیں
اس کے پاسباں ہیں یہ سایۂ جمال بھی
چاند کے قریب ہیں کہ ہالے دور دور ہیں
آب و دانہ کھینچ کر پار دیس لے گیا
ہم نے لاڈ پیار سے جو پالے دور دور ہیں
بلبلوں کو حکم ہے کہ آشیانوں میں رہیں
پہنچے ان کے گیت اور نالے دور دور ہیں

مسعود چودھری

اپنے بازو آزمانا چاہتا ہوں
دُشمنوں کے سر جھکانا چاہتا ہوں
غم زدہ ماحول کب سے ہے مسلط
میں اسے خوش تر بنانا چاہتا ہوں
جو ستم ڈھائے ستم پرور نے مجھ پر
بن کے فاتح بھول جا نا چاہتا ہوں
دُور کرنا ہے جہاں سے نفرتوں کو
باغ اُلفت کے لگانا چاہتا ہوں
میرے چاروں طرف ہے جس کی نحوست
اُس جہالت کو مٹانا چاہتا ہوں
جو تلف خارِ مغیلاں کر سکیں گی
پھول اور کلیاں اُگانا چاہتا ہوں
شوخ تارے ''سندر انشاں'' ارغواں گل
مانگ میں تیری اُگانا چاہتا ہوں
خود کُش و سفاک لوگوں کی یہ ہستی
اپنی دھرتی سے مٹانا چاہتا ہوں
دیتے ہیں فرقہ پرستی کا درس جو
دار پر اُن کو چڑھانا چاہتا ہوں
تھام کر مسعودؔ پرچم رفتوں کا
عظمتِ رفتہ دکھانا چاہتا ہوں

محمد علی مضطر عارفی

ناداں اُلجھ رہے ہیں عبث آفتاب سے
ہم نے دکھا دیا تھا حوالہ کتاب سے
یہ اور بات ہے کہ ابھی مطمئن نہ تھا
خاموش تو وہ ہوگیا تھا اس جواب سے
آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر دیکھتی نہ تھیں
کوئی بڑا عذاب نہ تھا اس عذاب سے
لہروں میں چُھپ گئے تھے کنارے کٹے ہوئے
بچ کر نکل گیا تھا سفینہ سراب سے
اللہ بھیج سایہ ابرِ رواں کوئی
مرجھا گئے ہیں دھوپ میں چہرے گلاب کے
کچھ بند پانیوں سے تعلق نہیں رہا
سیراب ہوکے آئے ہیں رودِ چناب سے
کچھ تو جواب دیجیئے، شبنم بھی رولئے
پھولوں نے احتجاج کیا ہے چناب سے
کچھ تمیز اچھے برے کی نہیں رہی
دھندلا گئی ہیں سرحدیں اس انقلاب سے
میلی نگاہ سے انہیں دیکھا نہ ہو کہیں
کملا گئے ہیں گل نگہ انتخاب سے
آئینہ مرے کانپتے ہاتھوں سے گر گیا
میں بال بال بچ گیا یوم الحساب سے
مضطرؔ کے نام پر خطِ تنسیخ کھینچ کر
خود کو تم نے خارج کردیا نصاب سے

ثاقب زیروی
سر ظفراللہ خاں کی وفات پر

کیا شخص تھا کہ بانٹنے آیا تھا رنگ و نور
تاریکیوں کا نام جہاں سے مٹا گیا
گفتار میں تھا کِھلتی بہاروں کا بانکپن
رفتار سے ہواؤں کو چلنا سکھا گیا
دینِ خدا کی آرزُو تھی مقصدِ حیات
پہنچا جہاں بھی پیار کا دریا بہادیا
لگتا تھا دیکھنے میں جو انسان کم سخن
جب بولنے پہ آیا زمانے پہ چھا گیا
تھی اُس کی ذات مشعلِ انوار آگہی
جینے کا زندگی کو قرینہ سکھا گیا
ظفراللہ خاں قائد اعظم کا دستِ راست
عالم پہ اپنی دھاک بٹھا کر چلا گیا

ایس۔ایم۔تقی حسین

دکھ سہنے کا گر اور ستمگر کا ستم اور
ہم جور پرستوں کی ہیں غم اور ستم اور
کچھ ایسے بھرے بیٹھے ہیں وہ ہم سے ستمگر
تیور ہیں اگر اور تو انداز ستم اور
ڈھونڈو گے اگر آپ تو ملنے کی نہیں ہم
محفل کے ستم اور، شب غم کے ستم اور
انکھوں کا وہ لہجہ بھی قرینہ کی زباں ہے
آے دوست ترے دکھ کا زخم اور ستم اور
ہہلو کے ہر اک زخم کا کب ہوتا مداوا
تھے کل کے زخم اور نئے غم کے ستم اور
کیا موسم گل کی ہو تمنا مرے دل کو
پت جھڑ کا ستم اور بہاروں کا ستم اور
آجاو کبھی شام کو مرقد پہ تقی کے
چمکے کا زخم اور تو کر لینا ستم اور

ماں۔احمد منیب

میرے دل میں بسی، جسم و جاں میں بسی
جس کے سینے سے لپٹا رہا رات دن
میری خاطر وہ جاگی کئی رات دن
ہے یہ خواہش کہ اس کے قدم چوم لوں
ہے سراپا محبت مری ماں مجھے
جس نے ناز و ادا سے ہے پالا مجھے
میری ادنیٰ سی خواہش میں جاں جھونک دی
میں اگر آج کچھ ہوں اُسی کا تو ہوں
جس کی چاہت کا کوئی کنارا نہیں
اک عجب سلسلہ ہے محبت کا ماں
اِن محبت کی کڑیوں میں اِک میں بھی ہوں
دھوپ میں چھاؤں ہیں اُس کی یادیں مجھے
ایک تعویذ ہیں اُس کی باتیں مجھے
میرے تاریک گھر کا دیا میری ماں
مجھ کو تنویرِ دل، آسرا میری ماں
میرا تن،من، ہے دھن اور جاں میری ماں
میرا گھر اور دھرم، آستاں میری ماں
میری ماں تیرے دکھوں کو جھیلوں گا میں
تیرے زخموں کو پلکوں سے سی لوں گا میں
اے خدا! میری ماں ہے مری زندگی
اے خدا! میری آنکھوں کی ماں روشنی
اے خدا میرے خوابوں کی تعبیر ماں
اے خدا! میرے جذبوں کی تعمیر ماں
اے خدا!اک کلی ہوں میں جس باغ کی
اُس بھرے باغ میں میرا مالی ہے ماں
میرے ماں باپ کو رکھ سلامت کہ میں،
تجھ سے کرتا ہوں یہ التجا اے خدا!

مبارک صدیقی

خِزاں کے شہر میں خوشبُو سے گھر بناتا ہے
وہ اک نِگاہ سے سو سو دیے جلاتا ہے
جہاں وہ جھیل پہ ٹھہرا تھا چند لمحوں کو
وہاں پہ آج بھی پریوں کا غول آتا ہے
وہ لب کُشا ہو تو رک جائیں گردشیں کتنی
وہ چپ رہے بھی تو غزلیں کئی سُناتا ہے
وہ حُسن دیکھ کر اک جوتشی یوں کہنے لگا
ہزار سال میں اک ایسا شخص آتا ہے
وہ میرے سامنے کہتا ہے بے وفا دنیا
میں جانتا ہوں وہ اکثر مجھے سُناتا ہے
اُسی کے حُسن سے غزلیں کشید ہوتی ہیں
وہ مُسکرائے تو محفل کو جگمگاتا ہے
سُنا ہے پھول بھی مڑ مڑ کے اس کو دیکھتے ہیں
وہ ایک شخص جو شاعر بہت بناتا ہے
یہ چاند، چاندنی بادل اُسی کا لہجہ ہیں
وہ آسمان کے موسم زمیں پہ لاتا ہے

عبدالمنان ناہید

تجھے خوشی کہ تجھے مل گئے ہیں افسرو تاج
مجھے یہ غم ترے ایماں کی کِشت ہے تاراج
تری حیات کے انداز مومنانہ نہیں
یہودیانہ عقائد فرنگیانہ رواج
کہیں سے ڈھونڈ کے مٹکے مئے حجاز کے لا
نئی شراب سے برہم ہے زندگی کا مزاج
دل و دماغ نہیں وسعتِ نگاہ نہیں
کر احتیاط سے تنگ دامنی کا علاج
جو پاسِ عشق و وفا ہو توعین دار پر بھی
حضورِ قلب سے اُٹھتا ہے نعرۂ حلاج
دلوں کی میل کبھی جبر سے نہیں کٹتی
خدا کی پادشہی تیغ کی نہیں محتاج
جو تیرے قلب کو ایماں کی چاشنی ہو نصیب
تو اپنے آپ بدل جائے کافرانہ سماج
تجھے یقیں ہو اگر لا الہ الا اللہ
زمیں تو کیا تجھے آسماں بھی دے خراج

دل کردا اے
امجد مرزا امجدؔ

دل کردا اے تیری غزل اُڑا لاں میں
ناں اپنے توں اس نوں سنا لاں میں
جا کے پنج چھ مشاعراں وِچ
سُر نال اِس نوں گا لاں میں
فرق کی پینا تیرے دیوان اندر
جے اک دو غزلاں چھُپا لاں میں
پتہ لگ جائے جد اِس چوری دا
گوڈے پھڑ تینوں منا لاں میں
امجدؔ مِل جان تیرے جئے شاعر مینوں
ہر سال دیوان چھپا لاں میں

ایس ایم تقی حسین

گلاب راتوں کی چاندنی میں تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے
تمہارے عارض کی نرم کرنوں میں سو ستاروں کی روشنی ہے
تمہاری آنکھوں کے سائباں میں دھنک کی شوخی رچی ہوئی ہے
تمہارے ہونٹوں کی سرخیوں میں ہزار پھولوں کی دلکشی ہے
تمہارے قدموں کی چاپ میں بھی کنواری ندیوں کی جلترنگ ہے
تمہاری باتوں کی نغمگی میں ہر ایک سرگم رباب رنگ ہے
تمہاری زلفوں کے مشک و عنبر شمیم جنت کی دوش پر ہیں
تمہارے چہرے پہ یہ نگاہیں مری خوشی کا پیامبر ہیں
تمہاری سوچوں کے پھول جانم میرے خیالوں کی سیج پر ہیں
میرے مقدر کے سارے جگنو شباب راتوں میں اشک تر ہیں
تمہاری خلوت کے انجمن میں سہاگ راتوں کا بانکپن ہے
تمہارا جلوہ نگاہ جانم ہزار شمعوں کی انجمن ہے
یہ میرے خوابوں کے ریزے ریزے چمن چمن جو بکھر گئے ہیں
شکست دل کے ہیں آبگینے پلک پلک جو سنور گئے ہیں
وصال و فرقت کی کشمکش میں لمحے زیر و زبر گئے ہیں
فراخ سینوں کی وسعتوں میں ہزار خنجر اتر گئے ہیں
تمہارے سینے کے زیر و بم میں جو میری سانسیں الجھ رہی ہیں
تمہاری آنکھوں میں میری آنکھیں تمام باتیں سمجھ رہی ہیں
کمال فن میں ہزار سنگت محبتوں کے ہزار نغمے
زد میں آئے جو شعلہ دل کے فلک کے تاروں کے دیکھے صدمے

طاہر سعود کرتپوری

بہت نایاب موتی دل ترے دریا میں باقی ہیں
وفا کے رنگ اگر احساس کی چڑیا میں باقی ہیں
اسی دھوکے میں بادہ خوار پیتا جارہا ہے مے
مزے کچھ اور شاید نشۂ بادہ میں باقی ہیں
بھلا یہ دل کی کٹیا تجھ کو کیوں دے دوں میں شہزادی
کسی کے زخم کے زیور اسی کٹیا میں باقی ہیں
وہ تہذیبیں جو تہذیبیں سبھی کا قد بڑھاتی تھیں
نہ اب پوتے میں باقی ہیں نہ اب دادا میں باقی ہیں
وہ جن سے اس کی عزت دوگنی ہوتی تھی شہری سے
وہ سب گُن اب کہاں اس گاؤں کی گُڑیا میں باقی ہیں
ابھی کافر نہیں ہوں میں ابھی امید زندہ ہے
ابھی کچھ گولیاں بیمار کی پڑیا میں باقی ہیں
وہ پہلے سی حسیں سوچیں وہ پہلے سے حسیں جذبے
کہاں خادم میں باقی ہیں کہاں آقا میں باقی ہیں
ابھی توہین سمجھا جا رہا ہے گھر کا بٹوارا
ابھی کچھ لوگ غیرت مند، اس دنیا میں باقی ہیں
مرے والد کو میں نے فخر سے کہتے سنا طاہر
میری مالا کے سب موتی ابھی مالا میں باقی ہیں

حافظ محمد مبرور احمد

بہت اونچی اڑانیں تھی اچانک کٹ گئے ہیں پر
کبھی آزادیِ جگ تھی اور اب محصور ہیں گھر پر
جنہیں تھا ناز طاقت پر وہ ہیں لاچار و بے بس اب
تکبر ٹوٹ کر بکھرا ہوئی حالت بہت ابتر
ہر اک ملک و نگر میں موت نے گاڑے ہیں پنجے بھی
ہر اک جا ہو کا عالم ہے بھیانک دنیا کا منظر
یکایک زندگی نے موڑ کیوں ایسا لیا سوچو
وہی کوچے وہی رستے مگر ویران ہیں کیونکر
ہر اک اپنی ہی فطرت کے مطابق جی رہا اب بھی
کوئی غفلت میں سوتا ہے کسی نے چھوڑا یہ بستر
کہیں سجدے دُعائیں صدقہ و خیرات ہیں دل سے
کہیں ہیں قہقہے شوخی دلوں میں کوئی نا ہے ڈر
کوئی خلقِ خدا کی خدمتوں میں محو ہے یکسر
کوئی خلقِ خدا کو لوٹتا دیتا انہیں چکر
کوئی لہو و لعب میں اب بھی ہے مشغول رات اور دن

کہ جیسے کچھ نہیں ہونا سدا رہنا ہے مال و زر
کوئی اصلاح کرکے آخرت اپنی سنوارے ہے
کوئی اس حال میں بھی پہلے سے بڑھ کر ہوا بد تر
یہ ہے موقوف اب تم پر کہ ان حالات میں حافظؔ
بدلنا خود کو ہے یا پھر یہاں رہنا ہے مثلِ خر

اسحاق ساجد (جرمنی)

موجودہ فضا کے پس منظر میں

بے بسی چھٹی ہے میرے ہرنگر ہر گھر کے ساتھ
ہر کوئی دستک مقفّل ہوگئی ہے در کے ساتھ
کب مٹا پرچھایوں سے دکھ کسی تنہائی کا
اب یہی عالم ہمارا ہے زمانے بھر کے ساتھ
فیصلہ کرنا ہے مشکل گھر سے نکلیں یا رکیں
سوچ تو الجھی ہے الفاظِ ''مگر'' اور ''پر'' کے ساتھ
وائے حسرت کوئی ان کو دیکھنے والا نہیں
پھول جو زیبِ چمن ہیں آج کرّ و فر کے ساتھ
سرفروشی، انکساری کا سلیقہ گر نہیں
سرفرازی بھی چلی جاتی ہے اونچے سر کے ساتھ
سر بسجدہ ہے زمیں پر آج انساں کا عروج
نارسائی اور ناچاری سے چشمِ تر کے ساتھ
راہوں بازاروں میں جو کچھ زندگی ہے وہ بھی ہے
سہمی سہمی، ہُو کے عالم میں، پریشاں، ڈر کے ساتھ

منوّر احمد کنڈے

چھُپ کے درد جو رہندے سی اوہ پہنچے نیں ہن گھر گھر
پتھر دے دروازے کندھاں ویخ کے کنبن تھر تھر
لوآں لگیاں ساڈے حصے ہجر دے بھانبھڑ آئے
جام وصل دے کسے نے پیتے چاٹی مٹکے بھر بھر
الفت نال بھری سی گُلّی ساڑ سُٹی اُس ویری
نفرت دا اِک محل بنایا لاکے سنگِ مرمر
خورے کیویں مار اڈاری بدل تیک اوہ پونچا
ظالم نے تے تُنب سٹیا سی اس پنچھی دا پر پر
جدوں دا سُنیا وُدھ منوّر ساڑ کے چھالے پاندا
ٹھنڈی ٹھار میں لسی پیواں پھوکاں مارا ڈرڈر

ایس۔ایم۔تقی حسین

گلاب زخم زخم ہیں، صلیب شاخ جان پر
شگفتگی کی گھات میں ہے موت اک اڑان پر
آئی ہے شام درد کی، صدائیں باز گشت ہیں
اور چاہتوں کی قبر ہے، افق کے اس کمان پر
یہ کچی کچی ساعتوں کی خوں فشاں نشانیاں
غریب شہر دوستاں، اسیر عشق آن پر
ہے رد درد عاشقی، تکرار ہے نہیں نہیں
میں پھر بھی بدگماں نہیں، آپ کے اس بیان پر
وہ تتلیوں کے رنگ تھے جو انگلیوں پہ رہ گئے
اک وصل ناتمام تھا شباب کے اٹھان پر
وہ مسکراہٹیں تقیؔ، آپ کی خفیف سی
دھنک کے رنگ ٹوٹتے تھے ہفت آسمان پر

راجہ محمد الیاس (لندن)

تیری ذات میں ایسا گم ہوا، میں اپنی ذات بھی بھول گیا
ہر بات تمہاری یاد رہی، ہر بات میں اپنی بھول گیا
میں چاند اور سورج کیا جانوں، کب چڑھتے ہیں کب ڈھلتے ہیں
نہ ہی دن کوئی یاد مجھے، ہر رات میں اپنی بھول گیا
تیری جیت مبارک ہو تجھ کو، میں بھی ہار کے بازی ہارا نہیں
تیری جیت کی خوشیوں میں کھو کر، ہر مات میں اپنی بھول گیا
تجھے پا کر یوں محسوس ہوا، ہر شے زمانے کی مل گئی
اب اور میں راجہؔ کیا مانگوں، ہر چاہت میں اپنی بھول گیا

ثمینہ رحمت (برسٹل)

تیرے ہر دکھ کو سہنے کی میری عادت پُرانی ہے
میری آنکھوں سے بہنے کی تیری عادت پُرانی ہے
تیرے شانوں پہ آنکھیں میچ کے سر اپنا رکھتی ہے
تیری بانہوں میں رہنے کی میری عادت پُرانی ہے
میری نظمیں میری غزلیں میرے بستر پر سوتی ہیں
حرف کے درد سہنے کی میری عادت پُرانی ہے
میں اپنی ذات کے اندر بھی کوئی ذات رکھتی ہوں
اسے ہر بات کہنے کی میری عادت پُرانی ہے
میں اپنی جیت کو تم پہ مسلط کس طرح کرلوں
مجھے تجھ سے ہرانے کی میری عادت پُرانی ہے
مجھے میری دعا نے کان میں آکے کہا اتنا
عرش سے لوٹ آنے کی میری عادت پُرانی ہے
خزاں کی شاخ کا پتہ بڑے ہی درد سے بولا
شجر سے ٹوٹ جانے کی میری عادت پُرانی ہے

نجمہ شاہین (لندن)

ہوش و حواس چھین لئے دل دُکھا دیا
مری وفا کا آپ نے اچھا صِلہ دیا
دشواریوں کو کس قدر آساں بنا دیا
اُس نے ہمارا حال سنا، مُسکرا دیا
محبوب نے کلام کا فن بھی سکھا دیا
دِل کی کسک نے ہم کو بھی شاعر بنا دیا
خود دیکھ لو جو زخم ہمارے جگر میں ہیں
ہم آپ کو کیا بتائیں کہ دنیا نے کیا دیا
رنج و الم سے کر کے دِل و جاں کو بے نیاز
اُس نے مجھے قتیلِ تبسّم بنا دیا
مر مر کے ہم نے عشق میں پائی ہے زندگی
ہم کو اجل کے وار نے جینا سکھا دیا
آیا وہ سامنے تو اُٹھا کر سبھی حجاب
نظروں نے اُس کو حالِ دل و جاں سُنا دیا
نجمہؔ اُسی کا نام ہے طوفانِ زندگی
جینے کا روز جس نے نیا حوصلہ دیا

سپنے

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

جولی! ہاں بولو میک! کل رات میں نے پھر ایک ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے او میک میں نے کتنی بار کہا ہے کہ یوں اوٹ پٹانگ سپنے نہ دیکھا کرو۔ پر جولی یہ سپنا کئی بار پہلے بھی آیا ہے تم سنو تو سہی۔ ہاں بتاؤ۔ کون سا سپنا تھا؟ میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے بہت سے لوگ جمع ہیں۔ میں لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے پہنچا تو دیکھا کہ خون میں لت پت ایک لاش پڑی ہے اور اس کا جسم جگہ جگہ سے تار تار ہو چکا ہے۔ دفعتاً کسی نے اس کا چہرہ سیدھا کیا تو تو... وہ، وہ چہرہ میرا چہرہ تھا۔ او میک تم تو یونہی پریشان ہوتے رہتے ہو۔ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ ویسے بھی میں تمھارے ساتھ ہوں نا۔ اور پھر وہ اس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے چہکتے ہوئے بولی: سنو سڑک کے اس طرف ایک نیا ہوٹل کھلا ہے چلو ادھر چلتے ہیں۔ پھر وہ دونوں خوش گپیوں میں ہوٹل کی طرف چل دیئے۔ اسی لمحے ان کو پیچھے سے روشنی کا ایک گولہ سا دکھائی دیا اور روشنی تیز اور قریب سے قریب ہوتی گئی۔ پھر ایک زوردار دھماکہ... ان کے ہاتھ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اس نے چلاتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ مگر جب اس کو دُھند کے چھٹ جانے کا احساس ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولی۔ سامنے میک کا جسم جگہ جگہ سے تار تار ہوا پڑا تھا اور لوگ اس کے اردگرد جمع تھے۔ رات کے اندھیرے میں شاید اس گاڑی کی بریک فیل ہوگئی تھی جو اس کو چیرتی ہوئی اس کے خواب کو حقیقت کا روپ دے گئی تھی۔

***

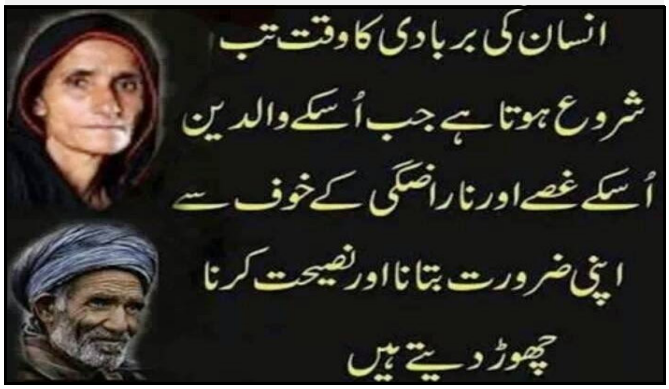

پرایا بوجھ

(افسانہ)

امجد مرزا امجدؔ

آج تیسرا دن تھا صوبیدار حاکم علی کو گم ہوئے۔ محلے کی مسجد میں دو تین بار اعلان ہو چکا تھا۔ حاکم علی کے دونوں بیٹے بھی اپنے بڑے بھائی کے گھر شہر میں پہنچ چکے تھے اور سارا شہر چھان مارا تھا مگر حاکم علی کا کہیں سراغ نہ ملا۔ چھوٹا بیٹا یاسین علی لاہور ملازم تھا۔ اسی کے پاس حاکم علی رہا کرتے تھے۔ یاسین علی عمر میں چھوٹا تھا مگر اپنے ظرف میں دونوں بھائیوں سے قد آور تھا۔ اس کی بیوی بھی حاکم علی کی بھتیجی تھی لہذا حاکم علی جب سے صوبیداری پینشن لے کر گھر آئے وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس ہی رہتے۔ مگر کبھی کبھی وہ اپنے بڑے اور منجھلے بیٹے کے پاس بھی جا کر رہ آتے مگر پھر چند دنوں بعد ان کی بیویاں بڑبڑانے لگتیں اور یہ بڑبڑاہٹ حاکم علی کو پسند نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب ان کی بہوئیں ان سے تنگ آنے لگی ہیں اور وہ اسی روز بیٹے کو کہتے اسے گاڑی پہ بٹھا آئے۔ اس بار تو منجھلا بیٹا خود انہیں لاہور سے لے کر آیا تھا کہ باپ کو بیٹے کے گھر گئے ہوئے سال سے اوپر ہو گیا تھا۔ بڑا بیٹا جب اپنے کسی کام سے جہلم گیا تو بھائی کو ملنے اس کے گھر جانے پر پتہ چلا باپ آیا ہوا ہے۔ تو بھابھی کو کہا کہ ابا جان کے کپڑے بیگ میں رکھ دو وہ انہیں اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لئے گاؤں لے جائے گا۔ آخر اس کا بھی تو کچھ فرض ہے اور پھر وہ گاؤں کے رشتہ داروں وغیرہ سے مل آئیں گے۔ منجھلی بھابھی نے ایک منٹ نہ لگایا اور سسر کے میلے کپڑے بھی بیگ میں ڈال دیئے منجھلا بیٹا دوکان پر تھا مگر بیوی کو علم تھا کہ وہ یوں اس کے باپ کو گاؤں بھیجنے پر ناراض نہیں ہوگا... حاکم علی کو ابھی تین دن ہی ہوئے تھے گاؤں میں اپنے بڑے بیٹے کے گھر جو شادی کے بعد والدین کے مکانوں میں ہی رہتا تھا۔ اور باپ کی زمین پر بھی اکیلا قابض تھا۔ کہ حاکم علی کی بہو کی بڑبڑ اس کے کانوں میں کن کھجورے کی طرح سرسرانے لگی۔ وہ اٹھ کر باہر نکل جاتا۔ گاؤں والے کسی نہ کسی رشتے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ حاکم علی کسی کے گھر چلا جاتا اور وہیں سے چائے پانی یا کھانا وغیرہ بھی کھا آتا۔ اور گھر آ کر بہو کو بتا دیتا کہ فلاں کے گھر گیا تھا وہیں سے کھانا کھا آیا ہوں۔ مگر روز روز کسی کے گھر جا کر بھی پیٹ بھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چوتھے دن دوپہر کو حاکم علی کی بہو نے سسر کو گھر میں بیٹھا ہوا دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔ ''تایا جی! آج آپ نے باہر نہیں جانا...'' حاکم علی نے نہ میں سر ہلایا۔ تو بہو بڑبڑ کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ صبح کی چائے اور ایک رس کھائے جب چار بج گئے اور حاکم علی کو کسی نے کھانے کے لئے نہ پوچھا تو وہ اٹھ کر رسوئی خانے گیا جہاں نہ کوئی موجود اور نہ ہی کچھ کھانے کو تھا بیٹا صبح سے دوکان پر گیا شام کو گھر آتا تھا اور بیوی سارا دن گاؤں میں مٹر گشت کرتی۔۔ حاکم علی نے بہو کو دو تین بار آواز دی مگر گھر میں کوئی ہوتا تو بولتا۔ بھوک سے بوڑھے جسم کو بھوک کے جالے نے ابے بس کر دیا کہ اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا دس روپے کا ایک نوٹ تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر پہنچا۔ سوچا کسی دوکان سے کچھ لے لوں۔۔ مگر بیٹے اور بہو کے رویّے پر غصے نے اس کے دانت ایک دوسرے پر ایسے جوڑ دیئے کہ منہ جڑ کے رہ گیا، اتنے میں جہلم جانے کی بس آن کھڑی ہوئی اور وہ اس پر سوار ہو گیا۔ آٹھ روپے کرایہ دیا اور اور دو روپے جیب میں رکھ کر پیٹ کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے کے سفر میں اس نے کئی بار اپنی گیلی ہوتی آنکھوں کو خشک کیا اور دل میں قسم کھائی کہ اب کبھی گاؤں میں بیٹے کو ملنے نہیں جائے گا اور آج ہی یاسین علی کو فون کرائے گا کہ وہ آ کر اسے لاہور لے جائے... جہلم کے اڈے پر اترتے ہی اسے چکر سا آیا اور وہ وہیں سیمنٹ کے بنے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا۔ بھوک سے اس کے پیٹ میں درد کی لہریں بے حال کر رہی تھیں۔ اس نے جیب میں پڑے دو روپے کے سکوں کو ٹٹولا... آس پاس دیکھا... بس کے اڈے پر کئی ہوٹل تھے مگر... دو روپے میں وہ کیا کھا لیتا... وہ اٹھا... اور ایک جھونپڑی نما ہوٹل والے سے پوچھا روٹی کتنے کی ہے... اس نے کہا دو روپے کی اس نے وہاں سے ایک روٹی لے لی۔ اور اس کو دوہرا کر کے کانپتے ہاتھوں سے منہ تک لے گیا... مگر... دکھ اور غصے کا منہ پر لگا تالا نہ کھول سکا اور بے اختیار رو پڑا... ساری عمر فوج کی نوکری کر کے ملک و قوم کی خدمت کی اس کی سرحدوں کی حفاظت کی، بچوں کے حقوق پورے کئے۔ ان کی شادیاں کرائیں۔ اپنی زمین مکان تک انہیں دے دیئے... اور آج... بھوکے پیٹ اپنے بڑے بیٹے کے گھر سے نکل آیا۔ ایک اجنبی جگہ پر ایک ٹھنڈی چملی سی روٹی ہاتھ میں لئے... اپنی بے بسی پر رو رہا ہے... نہیں... مجھے یہ روٹی بھی نہیں چاہیے... اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ایک مریل سا کتا اس کی طرف بھوکی

آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔۔حاکم علی نے اس کی طرف روٹی پھینک دی جسے اس نے جھپٹ کر اٹھالیا اور بھاگ گیا۔

حاکم علی نے لاری اڈے سے باہر نکل دیکھا کہ اسے کس طرف جانا ہے سڑک کنارے لگے کھمبے کا بلب بھی ٹوٹا ہوا تھا اور اندھیرے میں اسی کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کا گھر کس طرف ہے۔ بھوک پیاس اور نقاہت سے اس کا جسم کانپ رہا تھا...اس نے سامنے سڑک پار مسجد دیکھی تو وہاں چلا گیا۔وضو کیا اور نماز کی نیت کر لی...تیسری رکعت میں وہ سجدے میں گیا اور وہیں دہرا ہو کر مسجد کے بوسیدہ سے قالین پر گر پڑا...لاری اڈے کے سامنے والے اللہ کے اس گھر کو رات گیارہ بجے کے بعد تالہ لگا دیا جاتا تھا تا کہ کوئی بے گھر یا بھولا بھٹکا اللہ کا بندہ اس میں جا کر سو نہ جائے۔مسجد کے امام صاحب گھر سے کھانا کھا کر مسجد کو تالہ لگانے آئے تو کسی مسافر کو مسجد کے درمیان ٹانگیں سکیڑے لیٹا ہوا پایا اور اسے آواز دی...مگر حاکم علی کے کانوں میں موت نے خاموشی کی روئی ٹھونس دی تھی ...وہ بھوک ،محبت احترام جیسی جسمانی ودنیاوی ضرورتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔اب وہ نہ کیسی بیٹے کی ذمہ داری تھا نہ کسی بہو پر بوجھ...دوسرے دن ہر نماز کے بعد لاری اڈے کی مسجد میں اعلان ہوتا رہا مگر کوئی لاش کو وصول کرنے نہ آیا۔نہ ہی اس کی شناخت ہو سکی ۔۔پولیس میں رپورٹ کروادی گئی مگر گرمیوں میں لاش کو کہیں رکھنے کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے دن جب اسے لاوارث سمجھ کر دفنانے کے لئے اڈے کی مسجد کے امام اور دو تین مستقل نمازیوں کے ساتھ حاکم علی کا جنازہ جہلم کی جی ٹی روڈ پر سے گزر کر قبرستان جا رہا تھا۔اسی وقت اس کے چھوٹے بیٹے یاسین کی کار جی ٹی رود سے اتر کر لاری اڈے کی سڑک پر آئی جہاں سے کچھ ہی فاصلے پر اس نے منجھلے بھائی کے گھر جا کر اسے لے کر گاؤں جانا تھا باپ کی تلاش میں...''دیکھیں تو کسی بے چارے کا جنازہ ہے مگر ساتھ دو تین ہی آدمی ہیں...'' یاسین کی بیوی نے سڑک پار کرتے ہوئے جنازے کو دیکھ کر کہا۔''ہاں...شہروں میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے...ہمارے گاؤں کی برادری کی طرح ان کی رشتہ داریاں اتنی پھیلی ہوئی نہیں ہوتیں...'' یاسین نے ایک نظر چارپائی پر پڑے ہوئے جنازے کو دیکھا جسے چار مزدور قسم کے لوگ جنہیں جنازہ قبرستان تک چھوڑنے کے لئے بیس روپے پر امام صاحب نے سودا کیا تھا...پرایا بوجھ اٹھائے ہوئے برا سا منہ بنائے ہوئے تیز تیز جا رہے تھے...

***

مبارک صدیقی سروشؔ کی کتاب ''روشنی کا سفر''

پر مختصر تبصرہ اور منظوم ہدیہء تبریک

از۔ڈاکٹر منورؔ احمد کنڈے، ٹیلفورڈ، انگلینڈ

ایسا دورِ حالتِ نور، جہاں سے پھر کبھی تیرگی کا گذر نہ ہو انسانی روح کا منزہ اور خوبصورت تقاضہ ہے۔روحِ موسوی نے جب یہ تقاضہ اپنے خالق و پروردگار سے کیا تو چشمِ نبوی کو نا قابلِ برداشت روشنی کا دیدار کرایا گیا جو رہتی دنیا تک بغرضِ بصارت طور کو سرمہ کر گیا۔روشنی کا سفر نیک روحوں کا سفر ہے جو اردگرد کی تیرگی سے بیزار نورِ حقیقی کی تلاش میں سرگرداں اور محوِ جہاد رہتی ہے، اس امید اور یقین کے ساتھ کہ آخرِ کار سا گرِ نور میں تیرتا ہوا کوئی لمحہ اسے ضرور حاصل ہو کر رہے گا...!

لندن کے جناب مبارک صدیقی سروشؔ صاحب کی کتاب ''روشنی کا سفر'' کے دورانِ مطالعہ مجھے ایسے ہی جوہر کی موجودگی کا احساس ہوا جو اپنے حصار میں اندھیروں سے متنفر نا خوش اور خفا منزلِ پُرنور کی معطر شاہراہوں پر گامزن بے خوف وخطر مصروفِ سفر ہے۔اس کے ثبوت میں سروشؔ صاحب کے کلام میں سے تین اشعار پیش ہیں:

دیکھتا ہوں میں سورج نکلتے ہوئے تیرگی روشنی میں بدلتے ہوئے
برف کے قید خانے پگلتے ہوئے موسمِ گل کی خوشبو مچلتے ہوئے
یوں ہی جاری رہے دلکشی کا سفر آؤ کرتے رہیں روشنی کا سفر

محبوب سب سے بہتر ایک منفرد ذات ہوتی ہے اس سے کوئی دوسری چیز مماثلت نہیں رکھتی۔اسی موضوع کے تحت مبارک صدیقی سروشؔ صاحب کی ایک غزل ذیل میں قارئین کے لئے پیش ہے۔مجھے تعجب بھی ہے کہ یہ غزل کسی نغمہ سرا تک ابھی تک کیوں نہیں پہنچی ورنہ یہ اپنی نغمگی کے سبب یقیناً آفاقی شہرت پا چکی ہوتی:

خوشبو میں نہائے ہوئے خوابوں سے ہے بہتر
وہ شخص تروتازہ گلابوں سے ہے بہتر
دیکھے ہیں بہاروں کی طرح ہم نے بہت لوگ
وہ ہے کہ بہاروں کے شبابوں سے ہے بہتر
انگور کا پانی ہی ضروری نہیں ساقی
نظارۂ دلبر تو شرابوں سے ہے بہتر
پوچھے جو کوئی اہلِ سخن اس کا تعارف
کہہ دیتا ہوں غزلوں کی کتابوں سے ہے بہتر
اب چونکہ چنانچہ کی ضرورت نہیں کوئی
وہ سارے سوالوں کے جوابوں سے ہے بہتر

مبارک صدیقی صاحب نے اپنی تصنیف ''روشنی کا سفر'' بہت محبت سے مجھے ارسال فرمائی ہے۔میں ان کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے آخر میں ایک توشیحی نظم بطورِ ہدیہء تبریک اپنی جانب سے ان کی نذر کرتا ہوں:

کینوس کے رنگوں میں اَمر ہونے والی اَمرتا شیر گل

محمد نعیم یاد۔ جوہر آباد

قدرت نے انسان میں بے پناہ جواہر سموئے ہیں جس میں جوہرِ تخلیق خاص ہے۔انسان کو اس عظیم تحفہ کی بدولت ہی فنونِ لطیفہ میں دِلچسپی پیدا ہوتی ہے۔فنونِ لطیفہ میں جہاں خطاطی، موسیقی، مجسمہ سازی اور فنِ تعمیرات کو اہمیت حاصل ہے وہیں فنونِ لطیفہ میں فنِ مصوری بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔رنگوں سے کھیلنے اور تصویروں کو زبان دینے کا نام ہی مصوری ہے، مصور اپنے قلم اور رنگوں کے ملاپ کے بعد حقیقی عکس کینوس پر ڈال دیتے ہیں۔سقراط نے کیا خوب کہا تھا: شاعری بولتی ہوئی مصوری ہے اور مصوری خاموش شاعری ہے۔فنون لطیفہ کی اہمیت کا اندازہ علامہ اقبالؒ کی اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے انجمن ادبی کابل سے خطاب کرتے ہوئے کہی:

''میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے۔اسی بناء پر آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلہ تفریح، شاعر قوم کی زندگی کو آباد بھی کرسکتا ہے اور برباد بھی۔''فنونِ لطیفہ کے تمام تر شعبہ جات میں برصغیر پاک و ہند کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی۔ہندوستان جو کثیر المذاہب اور مختلف تہذیب وتمدن کا گہوارا رہا ہے جس کی مثالیں تاریخی تعمیرات، تاج محل، لال قلعہ، شاہی قلعہ، قطب مینار اور مختلف مساجد و منادر و دیگر مقامات پر بکھرے ہوئے فن پاروں میں ہندوستان کی تہذیب عظیم فن کاروں کی عکاسی کرتی ہے۔اُنہیں فن کاروں میں ایک اہم نام اَمرتا شیرِ گل کا ہے۔امرتا شیر گل، جسے انڈیا کی فریڈہ کاہلو کہا جا سکتا ہے وہ عظیم مصورہ ہیں جنھوں نے صرف اٹھائیس برس کی عمر پائی اور اس عمر میں فنِ مصوری میں رہتی دنیا تک اپنا نام ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔امرتا شیر گل ہندوستان کے ممتاز مصوروں میں شامل ہیں جنھوں نے جدید آرٹ کی بنیاد رکھی جو مغرب اور مشرق کا حسین امتزاج ہے۔

امرتا شیر گل 30 جنوری 1913ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ان کے والد کا نام عمراؤ سنگھ شیر گل مجیتھیا تھا جو ایک سکھ اور حکمران اشرافیہ سے تعلق اور سنسکرت اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔امرتا کی والدہ، میری اینٹونیٹی گوٹسمن، ہنگری سے تعلق رکھنے والی ایک یہودی اوپیرا سنگر تھیں۔امرتا شیر گل نے پانچ برس کی عمر ہی میں رنگ اور برش سنبھال لیے تھے۔مصوری سے اس کے شغف کو دیکھتے ہوئے والدین نے انھیں اٹلی بھیجا تا کہ مائیکل اینجلو اور ڈاونچی کی سرزمیں کے اساتذہ سے استفادہ کرسکیں۔اَمرتا کا وہاں دل نہ لگا اُن کیتخیل میں ہندوستان رچا بسا تھا وہ وہاں سے واپس ہندوستان آئیں تو ان کے والدین نیانھیں پیرس بھیج دیا جہاں انھوں نے فائن آرٹس سکول میں داخلہ لے لیا۔وہاں انھوں نے تقریباً چھ برس جم کر کام کیا اور پیرس کے نامور مصوروں کی معیت میں کام کرنے کے نادر مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

فن کسی کی میراث نہیں۔ایک اچھا فن کار وہی ہوتا ہے جو اپنے اندر چھپی قدرتی صلاحیتوں سے کام لیتا ہے۔وہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہے۔وہ کسی پہ گزرتے ہوئے ہر اُس لمحے کو اپنے اوپر اُسی طرح طاری کرتا ہے جیسے اُسی پہ بیت رہا ہو چاہے اس کا تعلق درد سے ہو، کسی تکلیف سے ہو، دل ٹوٹنے سے ہو یا محبت کے کسی نرم گزار پہلو سے۔تب اس کا برش کینوس پہ وہ سارے رنگ بکھیرتا ہے جو وہ اپنے گردوپیش میں محسوس کرتا ہے۔امرتا نے بھی سیماب صفت ذہن پایا تھا جو قدرت کے اس عطا کردہ تحفے کو کینوس پر بکھیرنا چاہتی تھیں۔1933ء جب وہ ہندوستان آئی تھیں تب ان کی آنکھوں نے ہندوستان کی جو سیر کی پھر دِل کے آئینے پہ جو نقش کیا اور برش کیذریعے جو کینوس پہ اُتارا وہ ایسے حسین شاہکار کے طور پر سامنے آئے کہ جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتے تھے۔مصوری میں ان کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز غریب، نادار اور محروم طبقہ ہوتا تھا اور اپنی پینٹنگز میں انہوں نے ہندوستانی دیہاتیوں اور خواتین کی بھرپور عکاسی کی۔اگر امرتا کی بنائی کی تصاویر کو فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انہیں اپنے جذبات پر پورا قابو تھا، اسی لئے ان کی تصویروں میں توازن پایا جاتا ہے۔شاید اس لیے انھیں ہندوستان کی سب سے مہنگی مصورہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔اگر امرتا شیر گل کی ابتدائی مصوری نمونہ جات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں غیر ملکی اثر زیادہ پڑتا دِکھائی دیتا ہے مگر ہندوستان آتے ہی ان کی مصوری کو جو رنگ ملتا ہے اس کی نظیر

نہیں ملتی۔اس حوالے سے وہ خود لکھتی ہیں کہ جونہی میں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اس وقت سے میری تصویروں میں خیالات اور رجحانات بدل گئے۔ان میں فنی اور بنیادی حیثیت سے بھی ہندوستانی رنگ شامل ہوگیا۔ اس وقت سے میرے دل میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا کہ میں اپنی تصویروں اور شاہکاروں کے ذریعہ ہندوستان کے غریب عوام کی ترجمانی کروں، ایسے عوام کی جو خاموش ہیں، صابر ہیں، جن کے جسم دھوپ کی شدت سے جھلس چکے ہیں جو زبان سے اُف تک نہیں کرتے بلکہ جن کی آنکھیں ان کے دلوں کی ترجمان ہیں۔ایک جگہ امرتا یہ بھی کہتی ہیں:

''میں نے ہندوستانی کسانوں کی ترجمانی اس طرح کی ہے جس طرح تھائی تیاں میں گوگاں نے کی۔ایک اور جگہ یہ بیان کیا ہے: ہندوستان میں موسم سرما کا تصور اس طرح سے آتا ہے کہ بڑے بڑے میدان اداس اور خاموش دکھائی دیتے ہیں، جن میں دور تک پیلی پیلی چمکدار فصلیں کھڑی نظر آتی ہیں او رکسان جن کے مٹیالے رنگ، اداس چہرے، دبلے پتلے جسم ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔'' 1934ء کو سمر ہل شملہ میں امرتا نے اپنا سٹوڈیو بنایا اور اپنے فن کو آگے بڑھایا۔کہا جاتا ہے 1935ء میں شملہ آرٹ سوسائٹی کی سالانہ نمائش میں امرتا شیرگل نے دس فن پارے بھیجے جن میں سے پانچ واپس کر دیئے گئے۔جس پہ امرتا کو غصہ آ گیا اور انھوں نے ادارہ کی طرف سے دیئے گئے مہاراجا فرید کوٹ انعام کو واپس کرتے ہوئے ایک تنقیدی خط بھی لکھا جس کو شملہ فائن آرٹ سوسائٹی نے آج تک سنبھالا ہوا ہے۔

1938ء ان کی شادی ہنگری سے تعلق رکھنے والے اپنے پہلے کزن ڈاکٹر وکٹر ایگن سے ہوئی اور بعد میں وہ بھارت منتقل ہوگئیں تا کہ وہاں اپنے آبائی گھر میں قیام کر سکیں جو بھارتی ریاست اتر پردیش کے شہر گورکھ پور کے علاقے سارایا میں ہے۔1941ء میں وہ اپنے خاوند کے ساتھ لاہور منتقل ہوگئیں جہاں انھوں نے لاہور کے مال روڈ (23 گنگا رام مینشن) میں رہائش اختیار کی۔امرتا شیرگل کے احباب میں بہت سے لوگ شامل تھے بہت سے دوست تھے جن سے محبت میں امرتا نے انھیں پورٹریٹ بنا کر دیئے خود امرتا نے اپنے تین چار پورٹریٹ بھی بنائے جن میں سے ایک میں کینوس پہ کام کر رہی ہیں، دوسری میں مسکراتی ہوئی بالوں میں کنگھا کر رہی ہیں۔ایک میں ان کی بہن بیٹھی ہیں۔

لاہور رہائش پذیر ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد 5 دسمبر 1941ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔یوں 30 جنوری 1913ء کو طلوع ہونے والا فنِ مصوری کا یہ ستارہ 5 دسمبر 1941ء کو لاہور کے افق سے عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب غروب ہوگیا 23 گنگا رام مینشن لاہور آج بھی اس عظیم مصورہ کا گھر موجود ہے جو ہمیں ان کی یاد دِلاتا ہے۔امرتا! تم سیزان کی مانند، رنگوں کو پانی کی طرح، پتلا نہیں کرتی، ادھار لیتی ہو گوگیں کی تصویروں سے، پیلی اداسی ،رسولن بائی کے گائن سی، کتھئی دھرتی پر اکثر، اداس چہرے، گم صم آنکھیں، بھٹکتی روحیں، ورق دل گیلا کرتی ہیں، کینوس پر رنگوں کے ہجے، چہروں میں تبدیل ہوتے ہیں، ابھی ابھی تو شروع ہوا تھا مکالمہ، رنگ اور برش کا، اور اچانک ختم ہوا، کینوس پر اب پھیل رہی ہے، پیلی اداسی کی اک نظم (نظم: کے بی فراق)

راجپوت راجہ کا تخلیق کردہ کیلنڈر۔رجل خوشاب

آج یکم وساکھ 2077 ب یعنی بکرمی ہے اور آج سے ایک نئے بکرمی سال کا آغاز ہوگیا ہے۔اس کیلنڈر کی کیا تاریخ ہے، اس کے تخلیق کار کون تھے اور اس کیلنڈر سے متعلق دیگر اہم باتیں کیا ہیں، آیئے اس پوسٹ میں پڑھتے ہیں.مہاراجہ وکرماجیت یا بکرماجیت کا اصل نام وکرما دتیا Vikramaditya تھا۔مہاراجہ وکرماجیت پنوار / پرمار راجپوت تھا۔مہاراجہ وکرماجیت حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے ایک صدی پہلے موجودہ بھارت کی اُس وقت کی ریاست اُجین کا شہنشاہ تھا، جو اپنی بہادری، دانائی، بلند ہمتی، شجاعت، جواں مردی اور عالی ظرفی کے لیے مشہور تھا۔اُجین کی یہ ریاست پرمارا سلطنت (Paramara dynasty) کہلاتی تھی. وہ اُجین کے بادشاہ گندھارورسنا Gandharvasena کا دوسرے بیٹا تھا، جو پرمارا سلطنت کا بادشاہ تھا۔بکرماجیت کی پیدائش 102 قبلِ مسیح ہے یعنی BC102۔بکرماجیت کے دورِ اقتدار کا آغاز BC57 سے شروع ہوتا ہے جب اس نے شاکاس Shakas کو شکست دی تھی، مہاراجہ شلوا Majaraja Shalva کی اولاد کوشا کا کہا جاتا تھا، جس کا ذکر مہابھارت میں بھی آیا ہے.شاکاس کو شکست دے کر اس واقعہ کو یادگار بنانے کے لیے بکرماجیت نے 56 قبلِ مسیح سے ایک کیلنڈر کا آغاز کیا جو تاریخ میں بکرمی کیلنڈر کہلاتا ہے. یہ کیلنڈر ابھی بھی پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور نیپال میں بڑے پیمانے پر استعمال ہوتا ہے، خاص کر دیہاتی علاقوں میں. نیپال میں آج

بھی بکرمی کیلنڈر وہاں کے سرکاری کیلنڈر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بکرماجیت 117 سال تک زندہ رہا اور اس کا انتقال 15 ء میں ہوا۔اس کیلنڈر کی دیگر تفصیلات کچھ اس طرح سے ہیں: بکرمی ۔ پنجابی۔ دیسی کیلنڈر۔ برِصغیر پاک و ہند کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس خطے کا دیسی کیلنڈر دنیا کے چند قدیم ترین کیلنڈرز میں سے ایک ہے۔اس قدیمی کیلنڈر کا اغاز 102 قبلِ مسیح میں ہوا۔ اس کیلنڈر کا اصل نام بکرمی کیلنڈر ہے، جبکہ پنجابی کیلنڈر، دیسی کیلنڈر، اور جنتری کے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔بکرمی کیلنڈر کا آغاز 102 قبلِ مسیح میں اُس وقت کے ہندوستان کے ایک بادشاہ راجہ بکرماجیت کے دور میں ہوا۔راجہ بکرم کے نام سے یہ بکرمی سال مشہور ہوا۔اس شمسی تقویم میں بکرمی سال ویساکھ کے مہینے سے شروع ہوتا ہے۔تین سو پینسٹھ (365) دنوں کے اس کلینڈر کے نو مہینے تیس (30) تیس دن کے ہوتے ہیں، اور ایک مہینہ وساکھ اکتیس (31) دن کا ہوتا ہے، اور دو مہینے جیٹھ اور ہاڑ بتیس (32) بتیس دن کے ہوتے ہیں۔

ویساکھ (وسط اپریل۔وسط مئی) جیٹھ (وسط مئی۔وسط جون)
ہاڑھ (وسط جون۔وسط جولائی) ساون (وسط جولائی۔وسط اگست)
بھادوں (وسط اگست۔وسط ستمبر) اسو (وسط ستمبر۔وسط اکتوبر)
کاتک (وسط اکتوبر۔وسط نومبر) مگھر (وسط نومبر۔وسط دسمبر)
پوہ (وسط دسمبر۔وسط جنوری) ماگھ (وسط جنوری۔وسط فروری)
پھاگن (وسط فروری۔وسط مارچ) چیت (وسط مارچ۔وسط اپریل)

بکرمی کلینڈر (پنجابی دیسی کیلنڈر) میں ایک دن کے آٹھ پہر ہوتے ہیں، ایک پہر: جدید گھڑی کے مطابق تین گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ان پہروں کے نام یہ ہیں: دھمی ویلا: صبح 6 بجے سے 9 بجے تک کا وقت۔

دوپہر ویلا: صبح کے 9 بجے سے دوپہر 12 بجے تک کا وقت

پیشی ویلا: دوپہر کے 12 سے دن 3 بجے تک کا وقت۔

دیگر ویلا: سہ پہر 3 بجے سے شام 6 بجے تک کا وقت۔

نماشاں ویلا: رات کے اوّلین لمحات، شام 6 بجے سے لے کر رات 9 بجے تک کا وقت۔ کفتاں ویلا: رات 9 بجے سے رات 12 بجے تک کا وقت۔ادھ رات ویلا: رات 12 بجے سے سحر کے 3 بجے تک کا وقت۔اسور ویلا: صبح کے 3 بجے سے صبح 6 بجے تک کا وقت۔لفظ 'ویلا' وقت کے معنوں میں برصغیر کی کئی زبانوں میں بولا جاتا ہے۔

***

کرونائی دور اور اہل وطن کا چلن

تمثیلہ لطیف

جب سے دنیا بنی عذابوں اور ثوابوں کی طرح وبا بھی آتی جاتی رہی دنیا پہلی بار وبا کو نہیں جھیل رہی۔ وبا میں جس طرح عام طرز زندگی متاثر ہوتا ہے ایک خاص ہمدرد انداز ان دنوں کی مشکلات کو سہل بناتا ہے۔ رنگ، نسل، مذہب کی تخصیص کے بغیر ہر کس و ناکس کو اپنائیت سے گلے لگایا جاتا ہے۔مخیر حضرات اپنے خزانوں کے منہ خلق خدا کے لئے کھول دیتے ہیں۔ وبا جنہیں لے گئی وہ اچھی جگہ پہنچ گئے جو بچ گئے وہ دنیا کے کاروبار کو پھر رواں کر کے آگے بڑھتے ہیں۔موجودہ کرونائی وبا کو لیکر شکوک وشبہات ہیں اور ایسے شواہد بھی موجود ہیں جو اس وبا کو ماضی کی وباؤں سے مختلف بتاتے ہیں۔قدرتی وبائیں مخصوص علاقوں تک محدود رہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ خالق مخلوق کی جان پر بنادے۔ وہ وبائیں مخلوق خدا کے لئے تنبیہ تھیں کے اپنے اعمال کو سدھار کر بہتر معاشرہ تخلیق کریں جہاں ضروریات زندگی ہر امیر غریب کی پہنچ میں ہوں۔قدرتی وبا انسانوں کو سبق دینے کے لئے آئی انسانی وجود کی بقا کا امتحان نہیں بنی۔ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وبا ایک علاقہ میں پھوٹی اور پھیل کر پوری دنیا کو لپیٹ میں لے لیا۔ بہرحال وجوہات جو بھی ہوں دنیا کرونائی دور سے گزر رہی ہے۔ یہود و نصاری کے مخیر حضرات عوامی خدمات کے لئے میدان عمل میں ہیں حکومتیں ریلیف پیکجز کے ذریعے عوامی زخموں پر مرہم رکھ رہی ہیں۔قرنطینہ کی طرز زندگی نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے لیکن احساس کی جڑیں اب بھی ہر انسان کو شجر انسانی سے جوڑے ہوئے ہیں۔مغربی ممالک میں لوگوں کا طرز عمل مثالی و قابل تقلید ہے۔ایک ہاتھ سے دو تو پہلے کو پتہ نہ چلے اس حدیث سے ناواقف ہو کر بھی وہ اس حدیث پر عمل پیرا ہیں۔لب سڑک ضروریات زندگی کے شاپرز و بنڈل پڑے ہیں لوگ بقدرِ ضرورت لیکر اپنی راہ ہو لیتے ہیں نہ کوئی رکھوالا نہ سیلفی کا مارا وہاں موجود ہوتا ہے۔

اس تناظر میں جب وطن عزیز پر نظر ڈالتے ہیں تو ندامت و پشیمانی گھیر لیتی ہے۔ اگر ٹیکنالوجی یہ برتری حاصل کر لیتی کہ لکھے ہوئے کیساتھ ویڈیو ثبوت بھی نتھی کر سکتے تو ایسی کتنی ویڈیوز و تصاویر دکھائی جاسکتی تھیں جن کے سامنے انسانیت شرمندہ کھڑی ہوتی۔ ان مناظر کی تصویر کشی کیسے کی جائے

جہاں ایک ضرورت مند بچی ایک انسان نما جانور سے آٹے کا تھیلا وصول کررہی ہے اور اس کا سر اتنا جھکا ہوا ہے کہ شکل نظر نہ آئے اور وہ ہمدردوں کا چیمپین ایسے تن کر کھڑا تصویر بنوا رہا ہے کہ جیسے اسکی نیکی کی قبولیت کی بشارت لیکر فرشتے نازل ہوئے ہیں۔ بنک کے اے ٹی ایم جہاں ہینڈ سینیٹائزر عوامی سہولت کے بطور رکھے گئے ہیں لوگ مشین استعمال کرتے یا بہانہ سے آکر وہ بوتل اٹھا کر اس شان سے نکلتے ہیں کہ دیکھ کر آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ بنک میں رکھی وہ بوتل کسی مزدور، پھیری والے، خوانچہ فروش نے نہیں اٹھائی۔ پڑھے لکھے لوگوں کا یہ طرز عمل افسوسناک ہے۔

اس حساس صورتحال میں بھی ملکی مافیاز اپنی دونمبری سے تائب نہیں ہورہے۔ ایک گندم کے گودام میں گندم کے ذخیرے میں مٹی ملائی جارہی ہے تاکہ بوری کا وزن معیار کے مطابق ہو اور چیز کم تلے۔ حکومتی عہدہ دار مصنوعی قلت اور قیمتوں میں اضافے کے مجرم ہوتے ہوئے بھی صرف وزارت کی تبدیلی کی سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ ملک کے مخیر حضرات سلیمانی ردائوں میں گھسے عوام الناس کی نظر سے اوجھل ہیں۔ امیر شہر کے کتوں کے راج میں بلکتی عوام حکومت کا سر درد نہیں۔ راشن کی فراہمی کی سوشل میڈیائی خبریں کیا حقیقی مستحق تک پہنچ رہی ہیں جو ٹچ موبائل تو کیا سادہ موبائل بھی نہیں رکھتا۔ حکومت کا احساس پروگرام یا اور دیگر تکنیکی عوامی فلاح کے منصوبے حقیقی حقدار تک رسائی سے دور ہیں۔ 22 کروڑ کی آبادی میں کتنے آئی ڈی کارڈز کا ریکارڈ PTA کے پاس موجود ہے؟ اس اعداد وشمار کی روشنی میں خانہ بدوش اور کچی بستیوں پسماندہ علاقوں تک راشن کیسے پہنچانا ہے کوئی حکومتی موثر منصوبہ نہیں۔ پولیو ورکرز کے ذریعہ غریب عوام تک گھر بیٹھے کوئی میلہ اور دھکم پیل کے بغیر باوقار طریقہ سے راشن کی فراہمی ممکن بنائی جاسکتی ہے لیکن یہ باتیں حکومتی عہدہداروں کی سیاسی منشوروں میں نہیں۔ اس طرح صرف عوامی غم وغصہ اور احساس محرومی پنپ رہا ہے جو کسی آتش فشاں میں نہ بدل جائے۔ ہم زندہ قوم ہیں۔ ہم سب کی ہے پہچان... بے ایمانی، جھوٹ، فراڈ۔ کون پوجے گا ان خداؤں کو۔

سنہری حروف

اپنی سوچ کو پانی کے قطروں سے بھی زیادہ شفاف رکھو
کیوں کہ جس طرح قطروں سے دریا بنتا ہے
اسی طرح سوچوں سے ایمان بنتا ہے۔۔

(حضرت علیؓ)

دلچسپ واقعہ

رجل خوشاب

خاندان کا پانچواں خلیفہ تھا' عباسیوں نے طویل عرصے تک اسلامی دنیا پر حکومت کی لیکن ان میں سے شہرت صرف ہارون الرشید کو نصیب ہوئی۔ ہارون الرشید کے دور میں ایک بار بہت بڑا قحط پڑ گیا۔ اس قحط کے اثرات سمرقند سے لے کر بغداد تک اور کوفہ سے لے کر مراکش تک ظاہر ہونے لگے۔ ہارون الرشید نے اس قحط سے نمٹنے کیلئے تمام تدبیریں آزمالیں' اس نے غلے کے گودام کھول دیئے' ٹیکس معاف کر دیئے' پوری سلطنت میں سرکاری لنگر خانے قائم کر دیئے اور تمام امراء اور تاجروں کو متاثرین کی مدد کیلئے موبلائز کر دیا لیکن اس کے باوجود عوام کے حالات ٹھیک نہ ہوئے۔ ایک رات ہارون الرشید شدید ٹینشن میں تھا' اسے نیند نہیں آ رہی تھی' ٹینشن کے اس عالم میں اس نے اپنے وزیراعظم یحییٰ بن خالد کو طلب کیا' یحییٰ بن خالد ہارون الرشید کا استاد بھی تھا۔ اس نے بچپن سے بادشاہ کی تربیت کی تھی۔ ہارون الرشید نے یحییٰ خالد سے کہا ''استاد محترم آپ مجھے کوئی ایسی کہانی' کوئی ایسی داستان سنائیں جسے سن کر مجھے قرار آ جائے'' یحییٰ بن خالد مسکرایا اور عرض کیا ''بادشاہ سلامت میں نے اللہ کے کسی نبی کی حیات طیبہ میں ایک داستان پڑھی تھی داستان مقدر' قسمت اور اللہ کی رضا کی سب سے بڑی اور شاندار تشریح ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں وہ داستان آپ کے سامنے دہرادوں'' بادشاہ نے بے چینی سے فرمایا ''یا استاد فوراً فرمایئے۔ میری جان حلق میں اٹک رہی ہے'' یحییٰ خالد نے عرض کیا ''کسی جنگل میں ایک بندریا سفر کیلئے روانہ ہونے لگی' اس کا ایک بچہ تھا' وہ بچے کو ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی چنانچہ وہ شیر کے پاس گئی اور اس سے عرض کیا ''جناب آپ جنگل کے بادشاہ ہیں' میں سفر پر روانہ ہونے لگی ہوں' میری خواہش ہے آپ میرے بچے کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں'' شیر نے حامی بھر لی' بندریا نے اپنا بچہ شیر کے حوالے کر دیا۔ شیر نے بچہ اپنے کندھے پر بٹھا لیا' بندریا سفر پر روانہ ہوگئی' اب شیر روزانہ بندر کے بچے کو کندھے پر بٹھاتا اور جنگل میں اپنے روزمرہ کے کام کرتا رہتا۔

ایک دن وہ جنگل میں گھوم رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک چیل نے ڈائی لگائی' شیر کے قریب پہنچی' بندریا کا بچہ اٹھایا اور آسمان میں گم ہوگئی' شیر جنگل

میں بھاگا دوڑا لیکن وہ چیل کو نہ پکڑ سکا'' یحییٰ خالد رکا' اس نے سانس لیا اور خلیفہ ہارون الرشید سے عرض کیا'' بادشاہ سلامت چند دن بعد بندر یا واپس آئی اور شیر سے اپنے بچے کا مطالبہ کر دیا۔ شیر نے شرمندگی سے جواب دیا' تمہارا بچہ تو چیل لے گئی ہے' بندر یا کو غصہ آ گیا اور اس نے چلا کر کہا'' تم کیسے بادشاہ ہو' تم ایک امانت کی حفاظت نہیں کر سکے' تم اس سارے جنگل کا نظام کیسے چلاؤ گے'' شیر نے افسوس سے سر ہلایا اور بولا'' میں زمین کا بادشاہ ہوں' اگر زمین سے کوئی آفت تمہارے بچے کی طرف بڑھتی تو میں اسے روک لیتا لیکن یہ آفت آسمان سے اُتری تھی اور آسمان کی آفتیں صرف اور صرف آسمان والا روک سکتا ہے''۔

یہ کہانی سنانے کے بعد یحییٰ بن خالد نے ہارون الرشید سے عرض کیا'' بادشاہ سلامت قحط کی یہ آفت بھی اگر زمین سے نکلی ہوتی تو آپ اسے روک لیتے' یہ آسمان کا عذاب ہے' اسے صرف اللہ تعالیٰ روک سکتا ہے چنانچہ آپ اسے رکوانے کیلئے بادشاہ نہ بنیں' فقیر بنیں' یہ آفت رُک جائے گی''۔ دنیا میں آفتیں دو قسم کی ہوتی ہیں' آسمانی مصیبتیں اور زمینی آفتیں۔ آسمانی آفت سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ زمینی آفت سے بچانے کیلئے انسانوں کا متحد ہونا' وسائل کا بھرپور استعمال اور حکمرانوں کا اخلاص درکار ہوتا ہے۔

یحییٰ بن خالد نے ہارون الرشید کو کہا تھا'' بادشاہ سلامت آسمانی آفتیں اس وقت تک ختم نہیں ہوتیں جب تک انسان اپنے رب کو راضی نہیں کر لیتا' آپ اس آفت کا مقابلہ بادشاہ بن کر نہیں کر سکیں گے چنانچہ آپ فقیر بن جائیے۔ اللہ کے حضور گر جائیے' اس سے توبہ کیجئے' اس سے مدد مانگیے''۔ دنیا کے تمام مسائل اور ان کے حل کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہوتا ہے جتنا ماتھے اور جائے نماز میں ہوتا ہے لیکن افسوس ہم اپنے مسائل کے حل کیلئے سات سمندر پار تو جا سکتے ہیں لیکن ماتھے اور جائے نماز کے درمیان موجود چند انچ کا فاصلہ طے نہیں کر سکتے۔

***

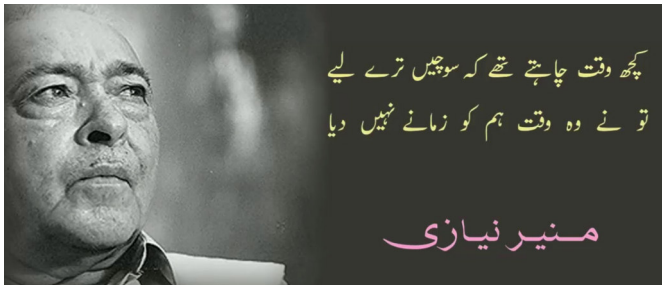

سلسلہ دلداری کا (عبّاس تابش) ایک مُطالعہ

اسلم چشتی پونے (انڈیا)

دُنیا کا کوئی بھی ادب سرحدوں کا پابند نہیں ہوتا - اپنی زبان، تہذیب اور فکر و فن کے ساتھ سرحدوں کو پھلانگ کر کسی بھی مُلک کی کسی بھی زبان کے ادبی حلقوں میں (ترجمے کے ذریعہ) پہنچ ہی جاتا ہے اور اُردو ادب تو چاہے دُنیا کے کسی بھی خطّے میں تخلیق پاتا ہو، دُنیا بھر کی اُردو بستیوں میں پہلے اپنی اصلی شکل وصورت کے ساتھ اُسکی رسائی ہو جاتی ہے۔ پھر اُس ادب کا وہ حصّہ جو توانا اور عالمی نوعیت کا ہوتا ہے ترجموں کے ذریعے دیگر زبانوں کے ادبی حلقوں میں اپنے جلوے دکھاتا ہے۔

جہاں تک ہند و پاک کے اُردو ادب کی بات ہے - زبان اور تہذیب میں یکسانیت ہونے کے ناطے دونوں جگہوں کے ادبی حلقوں میں قابلِ قبول ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں کے ادب کا ماضی بھی ایک ہے اور حال میں بھی یکسانیت اور یک رنگیت ہوتی ہے - معمولی فرق معاشیات، سیاسیات، سماجیات اور طرزِ فکر کا ضرور ہو سکتا ہے لیکن شاعری خاص طور پر غزلیہ شاعری کی پرورش دونوں جگہ یکساں طور پر ہوئی ہے - غزلیہ شاعری کے ارتقائی منازل مشترکہ طور پر طئے ہوئے ہیں - یہ سلسلہ عرصِ دراز سے جاری ہے - غزلوں کے مجموعے اکیسویں صدی کے سائنسی ترقّی کے دور میں بھی ان دونوں جگہوں پر خاصی تعداد میں شایع ہو رہے ہیں - ابھی کچھ عرصہ پہلے سرحد پار (پاکستان) سے ایک مجموعہ سلسلہ دلداری کا آیا ہے جو عبّاس تابش کی غزلیہ شاعری کی نمائندگی کرتا ہے انتخاب شکیل جاذب کا ہے جبکہ تزئین و اہتمام اشاعت کی ذمّہ داری صفدر حُسین نے قبول کی ہے الحمد پبلیکیشن (لاہور) نے اس کتاب کو ہر لحاظ سے خوبصورتی عطا کی ہے سن اشاعت 2013 ہے اور قیمت 200 روپئے ہے - ہمہ رنگی ٹائٹل کی یہ کتاب 176 صفحات پر مُشتمل ہے مُجھے بحیثیت قاری یہ حسین تحفہ پا کر خوشی ہوئی، مزید خوشی اُس وقت ہوئی جب میں نے اس کتاب کا مُطالعہ کیا - اس مُطالعہ کے حاصل کو قرطاس پر سجانا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ عبّاس تابش نے جذبات اور خیالات کو نظم کرنے میں بڑی محنت، محبّت اور حکمت سے کام لیا ہے - اِن اوصاف کے تاثر نے مُجھے کچھ سطریں لکھنے پر مجبور کیا ہے - اس سے پہلے کہ آگے گُفتگو کا سلسلہ شروع ہو کچھ اشعار اسی کتاب کے مُلاحظہ فرمائیں -

گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم ترے شہر سے جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم کو دل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا

دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے
ایک محبّت اور وہ بھی ناکام محبّت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے
تمہارے ساتھ کرنے کی بہت سی اور باتیں ہیں
غزل کا کیا غزل تو میں پرندوں کو سُنا لوں گا
اب اُس کو یاد بھی کرتا ہوں پوچھ کر اُس سے
یہ نوبت آئی ہے شرطیں قبول کرتے ہوئے

ان پانچ اشعار سے ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عبّاس تابش کی شعری سوچ کتنی مُختلف اور چونکانے والی ہے۔ یہ سوچ غزل کی ہیئت میں رچ بس جاتی ہے تو غزل کے شوقین کے لئے نیا ذائقہ فراہم کرتی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ تابش نئی غزل میں موضوعات کو اہمیت دیتے ہیں اور اچھوتے اور نت نئے مضامین نظم کرتے ہیں۔ انھیں ایسا کرنے میں دقّتیں ضرور آتی ہوں گی، زبان اور بیان کی صفائی اور شفّافیت کے لئے اُلجھنوں اور رکاوٹوں سے بھی واسطہ پڑتا ہوگا لیکن تابش اپنی بات کہے بغیر نہیں رہتے ۔ یہ ان کی غزل سے اُنسیت اور اپنی ذات اور خیالات کے اظہار کے لئے صنفِ غزل کو مُنتخب کرنے اور اہمیت دینے کا ثبوت ہے ۔عبّاس تابش کے اس مجموع کلام میں مُختلف بُحور میں غزلیں ہیں لیکن چھوٹی بحروں میں جو غزلیں ہیں وہ کچھ الگ ہی لُطف دیتی ہیں ۔صفحہ نمبر 44 اور 45 پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

دہکتے دن میں عجب لُطف اُٹھایا کرتا تھا
میں اپنے ہاتھ کا تتلی پہ سایا کرتا تھا

یہ غزل آٹھ اشعار پر مُشتمل ہے نَو بہ نَو مضامین لئے ہوئے یہ غزل داد کی مُستحق ہے کہ اس کے ہر شعر میں اظہار کے تیور الگ ہیں۔ رنگِ تغزّل شاعر کی سوچ لہر کی توانائی کو ظاہر کرتا ہے، اس غزل کے اور دو اشعار مُلاحظہ فرمائیں

اگر میں پوچھتا بادل کدھر کو جاتے ہیں
جواب میں کوئی آنسو بہایا کرتا تھا
ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی
اور اُس میں شام کو سورج نہایا کرتا تھا

عبّاس تابش کی جدّت پسندی یک رنگی نہیں ہمہ رنگی ہے۔ سوچ رنگوں کو الفاظ سے قرطاس پر paint کرنے کا ہُنر شاعر کو آتا ضرور ہے لیکن کہیں کہیں یہ رنگ پھیکے بھی پڑ جاتے ہیں لیکن بدرنگ نہیں ہوتے ۔ شاعر کے محتاط روّیے کی وجہ سے لاج رہ جاتی ہے۔ ایسے اشعار کو بھی کمزور اشعار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مضامینِ نو کو پیش کرنے کی کوشش کی ستائش لازمی ہے ۔ اس سے روایتی غزل پٹے پٹائے مضامین سے چھٹکارا پا کر نئے راستے اپنا سکتی ہے۔ اس شاعر کی غزل جہت اِسی طرح جاری رہی تو نئی غزل کو توانائی بخش سکتی ہے۔ فی الحال ان کی غزل کو تجرباتی نئی غزل کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ تابش نے عصرِ حاضر کی مروّجہ نئی غزل کے لفظیات کو نظر انداز کر کے اپنے لفظوں میں اپنی غزل کو سنوارنے سجانے کی کوشش کی ہے۔ اس شاعر کی طرح اور بھی غزل گو شعراء نے ایسی کوششیں کی ہیں اور کر بھی رہے ہیں لیکن اس مجموعے کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تابش کی غزل سوچ مُنفرد اور الگ ہے۔ کچھ اور اشعار مُلاحظہ فرمائیں۔

اس بات پہ دُنیا سے مری بنتی نہیں ہے
کہتی ہے کہ تلوار اُٹھا اور قلم رکھ
ہماری عمر میں جھوٹی تسلّی مار دیتی ہے
اگر انکار کرنا ہے تو کر انکار بسم اللہ
یہ جو ہے پھول ہتھیلی پہ اسے پھول نہ جان
میرا دل جسم سے باہر بھی تو ہو سکتا ہے
اس قدر گوندھنا پڑتی ہے لہو سے مٹّی
ہاتھ گھُل جاتے ہیں تب کوزہ گری آتی ہے
اپنے دُکھ اپنی ہی آنکھیں روتی ہیں
ہر گھر کا اپنا پرنالا ہوتا ہے

مختلف غزلوں سے مثال کے طور پر یہ چند اشعار اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ ان اشعار سے معلوم ہو کہ شاعر کے اظہار کے طریق کیا کیا ہیں، ویسے یہ یا اس مطالعے میں دیئے گئے اشعار شاعر کے شعر گوئی کی مُکمّل عکّاسی نہیں کرتے لیکن شاعر کے سُخن رنگ کی نُمائندگی ضرور کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں اور بھی کئی اشعار ایسے ملیں گے جو عبّاس تابش کو fresh diction کا خوش کلام شاعر ثابت کرتے ہیں بی مجموعی طور پر عبّاس تابش کی کتاب ''سلسلہ دلداری کا'' کی غزلیہ شاعری خوش فکر، خوش دل، جدّت پسند قارئین کو پسند آئے گی اس کا مُجھے یقین ہے۔ آخر میں اسی کتاب کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے جو موثر بھی ہے اور مُناسب بھی ''میر تقی میر'' سے لیکر آج تک ہم سب دل زدوں کیلئے شاعری ہی تو ڈھال ہے بی سو عبّاس تابش نے یہ ڈھال پہن رکھی ہے ہم دل زدہ لوگ جب بھی چاہیں عبّاس تابش کی غزل میں سانس لے سکتے ہیں بی یہ غزل بھلے مانس ہے۔ ہمیں پناہ دیگی۔ ہمارے اندر جوت جگائے گی اور ہمیں پھر سے زندہ کر دیگی۔ عبّاس تابش دل سے معاملہ بند نہ کرنا کہ بہت سے دل زدوں کا تم سے معاملہ ہے۔

(اصغر ندیم سیّد ص 16 کتاب ہذا)

استنبول کی مختصر تاریخ

سید حسن خان

کہا جاتا ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے لاکھوں سال پہلے سن BC میں اس شہر کو آباد کیا تھا۔ پہلے پہل اس شہر کی آبادی زیادہ تر ایشین سائڈ کی طرف آباد تھی۔ ساتویں صدی BC میں میگا کنگ بیاز نامی بادشاہ نے اس میں ایک کالونی بیازٹینم کے نام سے آباد کی۔ جبکہ یونانی نام اس کا بوسفورس رکھا۔ کنگ بیاز نے اس شہر کا نام اپنے چند قریبی معززین سے مشورہ کے بعد رکھا۔ یہاں پر نئے آباد ہونے والے شہریوں کو بالکل علم نہیں تھا کہ اس شہر میں داخل ہونے کیلئے Black Sea سے ہی آنا پڑتا ہے۔ 6th سینچری BC میں ایران اس پر حکمران تھا۔ پھر 4th سینچری BC میں الیگزینڈر دی گریٹ نے اس پر قبضہ کیا۔ اور دو سو سال اس شہر پر قبضہ کئے رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانۂ حکومت اس شہر نے خوب ترقی کی۔ 193 AD میں رومنوں نے حکومت کی۔ رومن حکومت کے زمانہ میں اس کو سارے رومن ایپائر کا کیپیٹل بنا دیا۔ رومن حکومت کے زمانہ میں اس شہر کو سات پہاڑوں پر پھیلا دیا۔ اس کا نام بائزنٹائن ایمپائر رکھ دیا گیا۔ بائزنٹائن حکمرانوں کے زمانہ میں مختلف نوادرات سے مزّین کر دیا گیا۔ جوں جوں اس شہر میں ترقیات ہوتی رہیں لوگوں کی توجہ سے اس شہر کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہوتا۔ 532 میں ایک نئے حکمران کے آنے سے یہ شہر تباہی کے کنارے پر آ گیا۔ مگر ہاگیا صوفیہ میں اس شہر کی رونقیں پھر سے دوبالا ہوگئیں۔ اس کے زمانہ میں اس شہر کو پھر سے ترقیات بخشی گئیں۔ اور اس کے زمانۂ حکومت کو گولڈن زمانہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد عربوں نے اس شہر کو سات اور آٹھ سینچری میں اپنے قبضہ میں لے لیا۔ 1204 سے 1206 تک عربوں کی حکومت نے پھر اس شہر کو تباہی کی طرف دھکیل دیا۔ اور ملکی کاروبار بالکل خسارہ کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک اس شہر نے بالکل ترقی نہیں کی۔ مگر 1453 میں ترک آٹومن کی حکومت پھر ترک آٹومن سلطان محمد دوئم نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے زمانۂ حکومت اس شہر کا نام اسلامبول رکھ دیا گیا۔ اور اس شہر کو آٹومن ایمپائر کا دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ نیز پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں اس شہر میں عوام کی سہولیات مہیا کیں گئیں جن میں بہت سی مساجد اور خوبصوت عمارات بنوائیں، جس سے اس شہر کی رونقوں اور تعداد میں پھر سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ اس کے زمانہ میں اس شہر کا نام اسلامبول سے استنبول رکھ دیا گیا۔ اسلامبول کا ترکی زبان میں سٹی آف اسلام تھا۔ آٹومن ترکوں نے اس شہر پر پہلی ورلڈ وار 1 پر حکومت کی۔ اس کے بعد 1923ء میں ترکی کی افواج نے پورے ملک پر قبضہ کر کے اس کا نام ریپبلک آف ترکی رکھا اور اس ملک کا دارالخلافہ انقرہ بنا دیا۔ آجکل استنبول کی آبادی 13 ملین کے قریب ہے اور دن بدن بڑھتی بھی جا رہی ہے اور معاشی لحاظ سے یہ شہر دن بدن ترقی پذیر ہے۔

عزیزم ریان احمد عارف کی پیدائش کے موقع پر

مبشر شہزاد۔ گلاسگو سکاٹ لینڈ

آج پھر سے ایک مسرت کا ہے دن
انتظاری کے تھے لمحے جس کے بن
بن کے درجنت کا آیا ہے ریان
نور کا پیکر ہے یہ گھر بھر کی جان
سب مبارک بادیاں ہیں دے رہے
نیک بن کر یہ بڑ ہے ہو شاد کام
ہے دُعا سب کی ہی اس بچے کے نام
تتلیاں بھی مسکرائیں پھول پر
شکر کے سجدے بجا لایا ہے گھر
دادا دادی بھی کریں شکر خدا
ابا امی نانا نانی دیں دعا
دونوں بھائی یہ محبت سے رہیں
ان کے گھر میں نہریں الفت کی بہیں

مسعود چودھری

خزاں کو گلستاں کرنا ہے ہم نے
چمن کو ہم زباں کرنا ہے ہم نے
جسے کہتا ہے غم سارا زمانہ
اُسی کو حرزِ جاں کرنا ہے ہم نے
ستاروں پہ کمندیں ڈالنی ہیں
زمیں کو آسماں کرنا ہے ہم نے
اکیلا پن کہاں تک ساتھ دے گا
غموں کو کارواں کرنا ہے ہم نے
نئے انداز میں بھرنی ہے پرواز
ہوا پہ آشیانہ کرنا ہے ہم نے
جسے اک اشک کہتا ہے زمانہ
اُسی کو بیکراں کرنا ہے ہم نے
شکستہ جام کی سب کرچیوں کو
دوبارہ ایک جاں کرنا ہے ہم نے
کڑکتی دھوپ کے صحرا میں مسعودؔ
بدن کو سائباں کرنا ہے ہم نے

اسحاق ساجدؔ

جرمنی میں برِصغیر کا ایک جمالی گیت کار

(تحریر۔ڈاکٹر منور احمد کنڈے، ٹیلفورڈ، انگلینڈ)

برِصغیر ہندو پاک میں گیت کی تاریخ عہد قدیم سے تعلق رکھتی ہے۔ گیت کی جڑیں قدیم پراکرت زبان و ادب اور موجودہ ہندی زبان وادب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جہاں تک اُردو زبان وادب کا تعلق ہے اس نے گیت کو ہندی سے مستعار لیا ہے۔ دکنی تہذیب کے ابتدائی دور میں ہندی اور فارسی کے ملے جلے الفاظ کو بروئے کار لا کر غنائی نظموں کی تخلیق رائج الوقت رہی ہے۔ یہ نظمیں اگرچہ گیت کہلانے کی مستحق نہیں ہیں پھر بھی ان میں گیت کا رس زیر و بم رنگ و آہنگ موسقیت اور غنائیت کے مرکب اجزاء کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شمالی ہند میں بھی گیت نما نظموں کا چلن رہا ہے لیکن ان کو گیت سے تعبیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ دراصل نظم اور گیت میں ٹیک کا بند ہی حد فاصل قائم کرتا ہے اور گیت کی پہچان بنتا ہے۔ برِصغیر ہندو پاک میں خالص گیت کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ڈاکٹر فراز حامدی بیکلؔ اتساہی نذیرؔ فتح پوری مناظر عاشق ہرگانوی، انور شیخ، سوہن راہی ساحر شیوی اور گلشن کھنہ کی طرح اسحاق ساجدؔ نے بھی بہت اچھے گیت تخلیق کئے ہیں۔ گیت کا فارم یا اُس کی ہیئت کسی مخصوص بحر و وزن کی پابند نہ ہو کر آزادی سے ہمکنار ہے۔ اسے کسی بھی وزن بحر ہندی چھند یا فارسی کی بحر میں تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیالِ خام میں گیت کار کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ جتنی سطروں کے بعد چاہے ٹیک کا بند استعمال کر سکتا ہے۔ گیت اگرچہ ایک داخلی جذبہ ہے لیکن خارجی سطح پر اس میں الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے گیت کو بحر ہی نہیں لفظ بھی غنائیت اور موسیقیت سے ہمکنار کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اس لیے اس میں روزمرہ استعمال میں آنے والے عام فہم سادہ اور مترنم الفاظ کا استعمال گیت میں لطف و تاثر کا موجب بنتا ہے۔ انگنت موضوع گیت کے دامن میں جگہ پا سکتے ہیں لیکن گیت کا حسن دوبالا کرنے کے لیے جنسِ مخالف کی باہمی محبت عشق و عاشقی قلبی واردات جذبات و احساسات اور وصل و ہجر قرار و انتظار غم و خوشی یاس و ہراس کامیابی و ناکامی جیسے معاملات کو موضوع اظہار بنایا جاتا ہے۔ اسحاق ساجدؔ نے بھی اپنے گیتوں میں ایسے ہی متعدد معاملات کو موضوع اظہار بنایا ہے۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ ''گیت میرے میت'' اس کی واضح مثال ہیں۔ ساجدؔ صاحب نے اپنے حالیہ شعری مجموعے ''جمال دوست'' میں بھی دس گیت شامل کئے ہیں اور انہیں کی روشنی میں یہ مضمون میں نے ترتیب دیا ہے۔ چونکہ لوک گیت کے بعد ہی گیت معرض وجود میں آیا اور لوک گیت کے خالق گاؤں کے کوی ہوتے تھے اس لیے ہمارے گیت بھی گاؤں کی بولی میں گاؤں کی زندگی کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ اسحاق ساجدؔ کا یہ گیت جو مل جل کر دریا پار کرنے کی تلقین کرتا ہے اس سکھی کے جذبات کا آئینہ دار ہے جو اپنی سکھیوں کو دریا پار کرتے وقت نئی زندگی کے شاندار مستقبل کی بشارت دیتی ہے۔

دور ہے منزل رستہ ہے دشوار سکھی --- آؤ کریں مل جل کے دریا پار سکھی

پیار کی راہیں دشوار ہوتی ہیں جن پر ہو کر طوفانی آندھیاں بھی گذرتی ہیں، پاؤں بھی لہولہان ہو جاتے ہیں۔ آبی سفر میں بھی طوفانی موجیں اور گرداب حوصلہ شکن ہوتے ہیں۔ موت کی آہٹیں ہر طرف سنائی دیتی ہیں۔ پھر بھی ایک نئی اُمید کے آسرے پر پیار کے راہی آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں مکمل گیت نقل کرنے کی گنجائش تو نہیں ہے پھر بھی گیت کا آخری انترا پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ٹوٹی کشتی تیز ہوا چڑھتا پانی — اس پر بھی کرتا ہے یہ دل من مانی
چھوتی ہیں امبر کو پھر اٹھتی لہریں — چین سے راہی دو پل اب کیسے ٹھہریں
دکھتے ہیں پھر طوفاں کے آثار سکھی — آؤ کریں مل جل کر دریا پار سکھی

آخری لائن ٹیک کا بند ہے۔ گیت کو دو مطلعوں کے بعد ٹیک کے بند کی ہم قافیہ ایک سطر کو جوڑ کر فارم یا ہیئت عطا کی گئی ہے۔ گیت میں تین فارسی کے الفاظ راستہ منزل اور دشوار کے علاوہ بقیہ سبھی ہندی کے عام فہم اور مترنم الفاظ سے گیت کی لڑی پروئی گئی ہے۔ جس سے گاؤں کی زندگی ماحول اور منظر سبھی نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ عام گیت سے قطع نظر موضوعاتی گیت تخلیق کرنا ایک مشکل کام ہے اور یہ مشکل کام قسمت کو موضوع بنا کر انہوں نے بڑی چابکدستی وفنی مہارت اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ گیت کی چند سطور (مصرعے) قسمت کی کارکردگی کا کیا خوبصورت مظاہرہ ہیں ملاحظہ ہو۔

اونچی مسند پر یہ بٹھائے — کبھی یہ دردر بھیک منگائے
عجب چمن میں گل یہ کھلائے — کبھی ہے محرم کبھی ہے ہولی
قسمت کھیلے آنکھ مچولی

گاؤں کے منچلے رنگ رنگیلے پریمی اور الہڑ شوخ و شنگ چنچل مستانی اور البیلی جوانیوں کا گاؤں کی کھلی فضا اور سرسبز و شاداب مناظر کے سائے تلے ایک دوسرے کے پریم جال میں پھنس کر محبت بھرے نغمے گنگنانا ناچنا اور گانا ایک روایت بن چکا ہے۔ جن پریمیوں کے دلوں کو محبت راس آجاتی ہے وہ سدا کے لیے عیش و نشاط کی سیج پر زندگی کا لطف لیتے ہیں اور جنہیں یہ محبت ٹھکرا دیتی ہے وہ بچھڑ کر برہا کے گیت گانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ برہا کی ماری ایک کنیّا اپنے بچھڑے پریتم کی یاد میں

کس طرح تڑپتی ہے کس طرح آنسو بہا کر اپنے پردیسی کو یاد کرتی ہے اس گیت میں اس برہن کی تصویر اسحاق ساجد کیا خوب اُتاری ہے ملاحظہ ہو۔

پاگل منوا تم سے پوچھے کب آؤ گے تم پردیسی
مجھ برہن پر کیا کیا بیتے کب آؤ گے تم پردیسی
برسوں کے ہیں ہم تم بچھڑے کب آؤ گے تم پردیسی
مجھ برہن پر کیا کیا بیتے کب آؤ گے تم پردیسی

مجازی عشق سے ہٹ کر اگر ہم اِس گیت کو عشقِ حقیقی سے جوڑ لیں تو یہی گیت فلکی بلندیوں کو چھو لیتا بشرطیکہ کسی ولیِ روحانی کے قلم سے جنم لیا ہوتا۔ اِسحاق ساجد اس زمرے میں شمار ہوتے ہیں یا نہیں، کم از کم 'میں' اِس حقیقت سے بے خبر ہوں۔۔!!! بہرحال گیت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ گیت وہی تخلیق کر سکتا ہے جس کا فطری طور پر اس صنفِ کی جانب سچا میلان ہو۔ اسحاق ساجد کے گیتوں کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسحاق ساجد جتنے اچھے غزل گو ہیں اس سے بھی اچھے گیت کار ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ گیت میں مشقِ سخن جاری رکھیں گے اور اُن کی کاوشیں انشاءاللہ ضرور ثمر آور ثابت ہوں گی۔

***

اپنے گریباں میں دیکھیں

سبزیوں پر رنگ، پیٹرول میں گندہ تیل بچوں کی چیزوں میں زہر آلود میٹریل، بھینس کو دودھ بڑھانے کے ٹیکے لگانا۔ جھوٹ بول کر گدھے کا گوشت کھلایا جانا۔ ہسپتالوں میں جعلی ڈاکٹرز۔ بازاروں میں بدنگاہی اور جھگڑے۔ مسلمان لڑکیوں کے ہاتھ میں قرآن پاک کی جگہ فحش ڈائجسٹ بے ریش چہرے۔ بے نمازی پیشانی۔ عبایوں میں فی مرد و عورت کا اختلاط۔ مردہ عورتوں کیساتھ قبروں میں ریپ۔ ٹی وی پر ننگے ناچ۔ بھائی بہنوں میں نفرت۔ ماں باپ کی عزت میں عدم تکریم۔ رشتے داروں سے قطع تعلقی۔ پڑوسیوں سے بدسلوکی۔ استادوں سے بدتمیزی۔ بغیر عمل کا علم۔ مساجد ویران۔ سینما گھر آباد۔ میاں بیوی میں نفرت۔ بچوں پر سختی۔ غربت کی آزمائش میں چوری۔ امیری میں تکبر۔ اپنے علم پر غرور۔ روزی میں حرام کی آمیز۔ ایک بے سمت ہجوم...!!! ایک ایسا ریوڑ جو سات عشروں میں بھی اپنی درست سمت کا تعین نہ کر سکا۔

ان تمام باتوں کے بعد حیرت زدہ و حیرت کدہ ہوں کہ ''صرف کیا آپ نے نہیں سنا کہ ظالم و جابر حکمراں کب اور کیوں مسلط ہوتے ہیں؟ کیا ایک پل کو ذہن و دل نے یہ سوچا یا محسوس کیا کہ ہم خود کتنے نیک ہیں؟ پھر کہتے ہیں دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں۔۔!!! یااللہ ہمیں ہدایت عطاء فرماء آمین یارب العالمین۔

***

شائق نصیر پوری کی غزل کا مزاج

اسحاق ساجد جرمنی

شائق نصیر پوری کی غزلیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ شائق نصیر پوری جو کہ جدید نسل کے شاعر ہیں اور قدیم و جدید کہ ہم آہنگی کو اپنا مسلک بنائے ہوئے ہیں۔ شائق نصیر پوری کی غزلوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فیضانِ فطرت کے سہارے ہی بڑے شاعر بننے کے خواب نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ حالات، زمانہ، ماحول اور رفتار کی امتزاج سے اپنی غزلوں میں روح پھونک رہے ہیں۔ اور شائق نصیر پوری کا مستقبل بہت شاندار نظر آرہا ہے۔ شائق نصیر پوری ایک حساس شاعر ہیں وہ امن کی فاختہ اُڑانا چاہتے ہیں۔ دلوں میں اُترنے اور لہو میں سرایت کر جانے والے اشعار معنی کو اُجالنے اور چمکانے کا کردار ادا کرتے ہیں۔

شائق نصیر پوری کی غزل میں ایک گداز ہے مخروطی ہے اُن کی نگاہ اپنے گردو پیش پھیلے ہوئے مناظر پر ہے جیسا کہ ان کے اشعار سے ملتی ہے۔ اشعار اُن کے فکری سانچے میں ڈھل کر باہر آتے ہیں اور وقت کے بیکراں سمندر کے ساحل پر موتیوں کی طرح جگمگاتے ہیں۔ شائق نصیر پوری کی غزل کی پہلی خوبی اسلوبی طہارت ہے انہوں نے اسے سجانے سنوارنے کی خاطر اپنا طریقِ بیان سادگی و پرکاری سے ہم رشتہ کیا ہے۔ آپ کی اکثر غزلیں فکر و احساس کی ندرت، روایت و رُجحان کی جدّت طرز ادا کی شدت کے عناصرِ ثلاثہ سے عبارت ہیں۔ عہدِ جاریہ میں معاملہ یہ ہے کہ شعرا کے پاس الفاظ تو ہیں لیکن مہمل، اظہار ہے لیکن بے معنی۔ لیکن نارسا! شائق صاحب کی شاعری اس کے برخلاف متاثر بھی کرتی ہے۔ مطمئن بھی کرتی ہے۔ بحیثیت مجموعی شائق نصیر پوری کی شاعری میں تہہ داری بھی اور تنوع بھی، تازگی بھی ہے، مارفتگی بھی ہے، جذبہ بھی عشق کی جدت بھی اور عزم کی شدت بھی۔ شائق نصیر پوری کا شعری سفر ابھی جاری ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ابھی انہیں اپنی شہرتوں کے آفاق پر شمس و قمر کی طرح اپنے نام و تخلص کی مناسبت سے اور درفشاں ہونا ہے اس اعتراف و اعتبار اور مقبولیت کی بہت سی بلندیاں مزید سر کرنا ہیں۔ میرے قیاس و خیال کی پیشگوئی، ان کے تخلیقی رنگارنگیوں، فنی و فکری جولانیو اور شعری و ادبی کارگذاریوں کی روشنی میں بخوبی اور بآسانی لی جاسکتی ہے۔

***

سراجؔ اورنگ آبادی صاحب

صوفی شاعر جن کی مشہور غزل 'خبر تحیر عشق' بہت گائی گئی ہے۔ بزرگ صوفی شاعر ''سراجؔ اورنگ آبادی صاحب'' کا یوم وفات 6/ اپریل 1963ء سراجؔ اورنگ آبادی، نام، سیّد سراج الدین۔ تخلص سراجؔ 11/مارچ 1812 ولادت۔ مارچ۔ وطن اورنگ آباد۔ وہیں تعلیم وتربیت پائی۔ آپ سادات کے ایک برگزیدہ خاندان کے فرد تھے۔ بارہ برس کی عمر میں ان پر وحشت طاری ہوگئی اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ کیفیت ساتھ سال تک رہی۔ وہ ایک درویش اور باکمال صوفی بزرگ تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد بہ کثرت تھے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اردو کی ایک ضخیم کلیات، فارسی اساتذہ کے کلام کا انتخاب اور ایک مثنوی ''بوستانِ خیال'' ان کی یادگار ہے۔ ولیؔ کے انتقال کے بعد سراجؔ شاعری میں ان کے قائم مقام سمجھے جاتے ہیں۔ (بحوالہ۔ پیمانہ غزل (جلد اول)، محمد شمس الحق، صفحہ:47)

صوفی شاعر سراجؔ اورنگ آبادی کے یومِ وفات پر منتخب اشعار بطورِ خراجِ عقیدت...

آئی ہے ترے عشق کی بازی دل و جاں پر
اس وقت نظر کب ہے مجھے سود و زیاں پر
آ شتابی سیں وگرنہ مجلسِ عشاق میں
ظلم ہے غم ہے قیامت ہے خرابی اے صنم
اس ادب گاہ کوں توں مسجد جامع مت بوجھ
شیخ بے باک نہ جا گوش مے خانے میں
تحقیق کی نظر سیں آخر کوں ہم نے دیکھا
اکثر ہیں مال والے کم ہیں کمال والے
ترے سخن میں اے ناصح نہیں ہے کیفیت
زبان قلقل مینا سیں سن کلامِ شراب
جس کوں تجھ غم سیں دل شگافی ہے
مرہم وصل اس کوں شافی ہے
حاکمِ عشق نے جب عقل کی تقصیر سنی
ہو غضب حکم دیا دیس نکالا کرنے
خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
دو رنگی خوب نہیں یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا
دیکھا ہے جس نے یار کے رُخسار کی طرف
ہرگز نہ جاوے سیر کو گل زار کی طرف
سنا ہے جب سیں تیرے حسن کا شور
لیا زاہد نے مسجد کا کنارا
عشق کا نام گرچہ ہے مشہور
میں تعجب میں ہوں کہ کیا شے ہے
سراجؔ ان خوب روّیوں کا عجب میں قاعدہ دیکھا
بلاتے ہیں دکھاتے ہیں لبھاتے ہیں چھپاتے ہیں

(سراجؔ اورنگ آبادی۔ انتخاب۔ اعجاز زیڈ ایچ)

اپنے گریبان میں ضرور دیکھیں

کچھ کبیرہ گناہ جن کی وجہ سے کرونا کا عذاب آیا۔

۱۔ چین کا حرام جانور کھانا۔ ۲۔ انگریزوں کا شراب پینا۔
۳۔ انگریز عورتوں کا لباس۔ ۴۔ سعودیہ میں نائٹ کلب۔
۵۔ بھارت کا کشمیر پر کرفیو لگانا۔

اب وہ صغیرہ گناہ جو کرونا کا سبب بالکل بھی نہیں ہیں۔

۱۔ معصوم بچیوں سے زیادتی کے بعد انہیں قتل کرنا۔
۲۔ چند مولویوں کا بچوں کے ساتھ مسجدوں میں بدفعلی کرنا۔
۳۔ دارالامان کا سیاسی درندوں کو بچیاں سپلائی کرنا۔
۴۔ رمضان اور عیدین کے موقع پر ناجائز منافع خوری۔
۵۔ ججوں کا شراب کو شہد ثابت کرنا۔ ۶۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینا۔
۷۔ عدالتوں میں صرف امیروں کو انصاف کا ملنا۔
۸۔ ججوں کا خود ماننا کہ اس ملک میں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں۔
۹۔ پولیس والوں کا عوام کو بے جا تنگ کرنا اور رشوت خوری۔
۱۰۔ دفتروں میں کلرکوں کا چائے پانی وصول کرنا۔
۱۲۔ رشوت اور حرام کے پیسوں سے حج عمرہ کرنا۔
۱۳۔ ہر دوسرے فقہ کے لوگوں کو کافر سمجھنا۔
۱۴۔ فیس بک پہ بدعات کی ترویج۔
۱۵۔ مزارات پہ غیر شرعی کام۔
۱۶۔ چائے کی پتی میں چنے کے چھلکے، آٹے میں ریتی۔
۱۷۔ چنے کے آٹے میں لکڑی کا بھوسہ، پھلوں میں میٹھے انجکشن۔

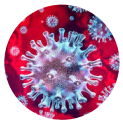

کرونا: نام یہ اتفاق نہیں خفیہ انتخاب ہے

یہ معلومات پڑھ کر آپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، وہم اور خوف سے دنیا میں پھیلائے گئے باطل نظریات کو ''کرونا وائرس'' کہا جاتا ہے۔کیا آپ جانتے ہیں یہ لفظ 'کرونا' یہودیوں کی مذہبی کتاب 'تلمود' میں بھی بڑے معنی خیز انداز میں موجود ہے۔کرونا کو عبرانی میں ایسے لکھا جاتا ہے اسکی معنی ہے پکارنا یا ''آواز لگانا'' کس کو پکارنا؟ اسکا جواب ہے، یہودیوں کا مسیحا۔آرتھوڈوکس یہودیت کے مطابق مسیحا جسے انگلش میں Moshiach یا Hashem کہتے ہیں، دجال نہیں بلکہ ایک ایسا لبرل یہودی النسل رہنماء ہوگا جو مسجد اقصی کو شہید کر کے اسکی جگہ دجال کیلئے ''ہیکل سلیمانی'' تعمیر کرے گا یہودیت کے مطابق جب وہ مسیحا آئے گا تو اس وقت سب لوگ گھروں میں چھپے ہوئے ہوں گے، اسے پکار رہے ہوں گے یعنی ہر کوئی اسے ان الفاظ سے پکار رہا ہوگا کہ کرونا کرونا کرونا کرونا....یعنی اے ہمارے مسیحا آجاؤ، آجاؤ، اب آجاؤ، آجاؤ۔اسکے علاوہ نئے کرونا وائرس کو (COVID-19) کا نام بھی یہودیوں نے دیا ہے اور آپ اسے بھی ہرگز اتفاق نہ سمجھیں۔میں ہمیشہ قارئین کو سمجھاتا رہا ہوں کہ یہودی ہمیشہ ذو معنی الفاظ ایجاد کرتے ہیں جن کا ظاہری مطلب کچھ اور جبکہ اصل مطلب کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

لفظ COVID یہودی مذہبی کتاب ''تلمود'' کے پانچویں باب Masechet Berachot کے پہلے پیراگراف میں کچھ اس طرح موجود ہے اسکی معنی ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک نماز کے لئے نہیں اٹھنا چاہیئے جب تک کہ اس کو کووڈ COVID نہ ہو۔کووڈ کیا ہے؟ یہودی علماء اسکی تشریح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے عاجزی، یعنی آپ کا اس بات پر ایمان ہو کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں اور ہاشم (مسیحا) کے بغیر ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے اس لیے ہمیں اس کو ''کووڈ'' COVID کے ساتھ پکارنا ہوگا، عاجزی سے اسے آواز دینی ہوگی اور کیا آواز دینی ہوگی؟ اسکا جواب ہے 19۔اب یہ 19 کیا ہے؟ یہاں 19 کا مطلب تلمود میں موجود یہودی نماز کا انیسواں کلمہ ہے۔یعنی ہمیں کرونا کے ساتھ 19 واں کلمہ دہراتے رہنا ہوگا جب ہی ہمارا مسیحا آکر مسجد اقصی گرا کر وہاں دجال کے لیے ہیکل سلیمانی تعمیر کرے گا۔اب آپ کو سمجھ آ گئی ہوگی کہ صیہونی اپنے پلانز کو کس طرح خفیہ ''ذو معنی الفاظ'' بنا کر پیش کرتے ہیں۔اب آپ اسرائیلی وزیر صحت اور وزیر دفاع کے بیانات ذہن میں لا کر ان پر غور کریں، جس میں ایک کہتا ہے کہ ہمیں کرونا سے کوئی پریشانی نہیں اور دوسرا کہتا ہے کہ ہمیں نجات دلانے والا ''مسیحا'' جلد آنے والا ہے۔اسکے علاوہ اسرائیل کے چیف نے بھی اعلان کیا ہے کہ مسیحا اسی سال آئے گا پچھلے دنوں آپ نے ٹویٹر پر اسکا ٹرینڈ بھی دیکھا ہوگا۔جی ہاں 100 فیصد بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں آپ اسی لیے سب کو گھروں میں قید کروا کے ہر جگہ کرونا کرونا کروایا جا رہا ہے۔یہ محض اتفاق نہیں ڈیجیٹل دور کے آغاز میں اس کرونا کے نام پر آپ کے لئے جو ویکسین تیار کی گئی ہے اس سے آپ کے دماغ سے حقیقی معبود کا خیال نکال کر آپ کو دجال کی پیروی پر آمادہ کیا جا رہا ہے لہٰذا اس لفظ کو بھی استعمال کرنے سے روکیں کیوں کہ کرونا وائرس نہیں صرف یہودیوں کا پیدا کیا گیا ایک باطل نظریاتی وہم ہے، اور اس وقت پوری دنیا میں اموات کی وجہ کرونا کی بجائے وہ خوف ہے جو ایک صحت مند انسان کس بھی چند دنوں میں قبر میں پہنچا سکتا ہے۔

***

Concept 2Print
DIGITAL LITHO
A Complete Design & Print Service
CONCEPT • DESIGN • PRINT • FINISH
• Business Cards • Letterheads • Compliment Slips
• Folders • NCR Pads • Brochures
• Booklets • Calendars • Posters
• Books • Flyers • Pull up Banners
• Wedding Cards • Greeting Cards • Invitation Cards
Tel: 0203 603 7582
e:info@concept2print.co.uk
106 High Street-Colliers Wood-London-SW19 2BT
WWW.concept2print.co.uk

حرف کی تقدیس

اے آر راجپوت

حرف کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ حرف کیا نہیں ہے تو غلط نہیں، حرف زندگی کی روح ہے۔ زندہ اور باضمیر زندگی کی روح، وہ آزاد رُوح جسے دنیا پابندِ جسم نہیں کر سکتی۔ وہ آزاد رُوح جو ذہنِ انسانی کی غذا بھی ہے اور پوشاک بھی۔ وہ آزاد رُوح جو انسانی شعور میں جلوہ گر ہے۔ غاروں سے خلاؤں تک انسان کے تمام تر ارتقاء کا محور یہی حرف ہے۔ کیا حرف جنم نہ لیتا تو انسان شعور کی ان منازل پر قدم رکھتا جہاں آج ہے؟ کیا ان علمی کاوشوں کا حرف کے بغیر تصور ممکن ہے۔ جنہوں نے انسان کو ممالیہ سے انسان بنایا؟ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آج بھی ان کو ممالیہ ہی پاتے ہیں۔ جنہیں حرف کا نہ شعور و ادراک حاصل ہے ورنہ ان کے دل اس کے احترام کا شائبہ بھی رکھتے ہیں۔ ع۔۔۔ ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر شائد کوئی خیال کرے کہ مقام حرف کو مجروح کرنے والے لوگ اس گروہِ انسان میں سے ہیں۔ جس نے کبھی مکتب کا منہ تک نہیں دیکھا جسے کبھی وہ سہانی خوشبو سونگھنی نصیب نہ ہوئی ہو جو تازہ کتاب کو مہکاتی ہے۔ جس نے ہمیشہ مدرس کو ہاتھ اٹھا کر سلام ہی کیا ہے۔ کبھی اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ اگر چہ خیال کیا گیا تو ہرگز ہرگز درست نہیں۔ کہ یہ گروہِ انسانی تو حرف کی تقدیس ماضی میں بھی کرتا رہا ہے اور آج بھی کر رہا ہے۔ ع۔۔۔ میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر۔ مقام افسوس یہ ہے کہ حرف کی تقدیس اُن کا نشانہ بنی ہے۔ جو مکتب کی روح رواں رہے ہیں جنہوں نے حرف سے ہی وہ عظمتیں حاصل کی ہیں جو شرفِ انسانی میں ممتاز و نمایاں ہیں۔ یعنی کشورِ علم و حکمت کے شہزادے اور جاگیر و قلم و قرطاس کے گدی نشین جن کے ہاتھوں حروف کا اعتبار و احترام بڑھنا چاہیئے تھا۔ وہ اس کے زوال کا سبب بنتے جاتے ہیں۔ ع۔۔۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ کثرت اشاعت کے اس دور میں حرف جتنا ارزاں اور بے وقعت ہو چلا ہے پہلے کبھی نہ تھا ہر دل جو حرف کی تقدیس واحترام کا قائل ہے۔ آج خون کے آنسو رو رہا ہے حرف تو وہی ہیں معنی بدل گئے ہیں۔ انصافؔ، آزادیؔ، جمہوریتؔ، مساواتؔ و رواداریؔ کے حروف زدِ عام ہیں مگر غور کرو تو جہاں انصاف کا حرف پیش کیا جا رہا ہے وہاں مافی الضمیر ''ناانصافی'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہی حال دوسری جگہوں پر ہے ہر حرف کو بے دریغ، بے سوچ، ڈھٹائی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں انسانیت سسک رہی ہے اور حقوق انسانی کا غلغلہ ایوانوں میں بلند ہو کر اس صدائے ناگوار کو مٹا رہا ہے۔ ع۔۔۔ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات۔۔۔ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور۔ کچھ کہ خود کو باقی انسانیت سے برتر و اعلیٰ گردانتے ہیں۔ بڑے بڑے قلم اور بڑے خوشنما حروف لیئے قرطاس پر براجمان ہیں ان کی تحریروں میں انسانیت کے دُکھ نہیں اپنے اور دوسروں کی لذت کے سامان جھلک رہے ہیں۔ حروف بِک رہے ہیں وہ راہنما جو اس دعویٰ پر قلم اٹھائے نکلے تھے کہ۔ ع۔۔۔ ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بدل گیا۔ آج زمانے کی ہم نوائی میں راگ الاپ رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ والٹیئر جیسوں کی جانشینی ہے۔ مگر عمل مطلق سمتِ مخالف ہیں۔ اخباروں میں، رسالوں میں، ہفت روزوں میں، ماہناموں میں، جریدوں اور ڈائجسٹوں میں حرف کی تقدیس ہر سو پامال ہے۔ کہاں گئے وہ۔۔۔ آہ کہاں گئے وہ شگفتہ طرز، وہ شیریں بیاں، کہاں گئے وہ حرف کو اس کے معانی سے ہم آہنگ رکھنے والے۔ گو جو لکھا سچ لکھا بڑا نام بڑے کام سے کمایا۔ کہاں ہے حالی، کہاں ہے ابوالکلام آزاد، کہاں ہے وارث شاہ اور کہاں ہے ورڈزورتھ؟ حرف کی تقدیس کے علمبردار آج کہاں ہیں؟۔۔۔ ع۔۔۔ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔ کیا اس دور میں کوئی ورڈزورتھ نہیں، کیا کوئی میرؔ آشکبار نہیں، کیا کوئی رُڈیارڈ کپلنگ فطرت میں مگن نہیں، کیا کوئی اقبال بانگِ درا لئے نظر نہیں آتا۔ ایسا نہیں۔ سب ہیں مگر دورِ نو کی گردشیں انہیں پابہ زنجیر کرتی ہیں۔ حروف کے اجارہ دار انہیں آگے آنے نہیں دیتے علم و حکمت کی انہار جاری نہیں رہنے دیتے کہ ضمیر انسانی کو پابند کرتے ہیں جبر اور تادیب سے ہے۔

اہل دل کے لئے اب یہ نظم بست و کشاد۔۔۔ کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد، زرد تحریروں والے ''ڈائجسٹوں'' کے اس دور میں کون لکھے اور کیا لکھے۔ کوئی آج ورڈزورتھ ہے تو کیسے کہ شگفتہ تحریروں کو ''بور تحریریں'' کے لیبل لگا کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ مقصد حیات ہی لذت کوشی ہو جائے تو کیا کیجئے۔ ع۔۔۔ کوئی سمجھائے کہ ہم سمجھائیں کیا؟۔ پھر ایک اندازِ قلمکاری وہ سامنے آیا ہے جس کا مقصد صرف اور صرف دوسروں پر کیچڑ اچھالنا اور خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر سنگ باری کرنا ہے ایک خاتون مضمون نگار ایسی بھی ہیں جنہیں اپنے عزیز و اقارب کو نشانہ بنانے ہی میں فصاحت و بلاغت نظر آئی۔ ع۔۔۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور۔ ان حقائق کا سرسری ادراک کرنے کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر چھوٹا بڑا جو قلم و قرطاس سے وابستہ ہے۔ حرف شناس ہے، کوشش کرے کہ حرف، قلم اور قرطاس کا تقدس قائم ہو۔ حرف تو اس لئے سکھائے گئے تھے۔'' کہ ہم ان کے ذریعے ایک دوسرے کے دل میں اُتر

جائیں مگر ہم نے تو ان کے ذریعے دلوں کا قتل عام شروع کر دیا۔'' کیوں نہ انسانیت کے وہ راہنما جنہیں قدرتِ اظہار ملی ہے جو حرف برتنا جانتے ہیں۔ حرف استعمال کرنے میں احتیاط کے خوگر ہوں۔ کیوں نہ ان کے حروف نفرتوں کی بجائے محبت بکھیریں۔ کیوں نہ ان سے نسلوں کو بگاڑنے کی بجائے سنوارا جائے۔ کیوں نہ ان سے قوم کے مختلف طبقات اور گروہوں کو یک جان کیا جائے۔ کیوں نہ ان کے ذریعہ دلوں کو دور کرنے کی بجائے قریب کیا جائے۔ آؤ اے قلمکارو! بڑو اور چھوٹو! حروف کی تقدیس قائم کریں اور ان باتوں کو عملی جامہ بھی پہنائیں۔ جو ہمارے پیش رو رہ چکے ہیں اور جن پر ہم داد دیتے دیتے بے حال ہو جاتے ہیں۔ شکسپیئر اور عمر خیام کو پھر جنم دیں۔ آؤ ورڈز ورتھ سامنے لائیں جو حسن فطرت کو سراہنے کا ذوق پیدا کر سکے آؤ پھر سے اپنی تحریروں کو عظیم انسانی اصولوں سے ہم آہنگ کریں اور پھر اپنی تحریروں سے دنیا اور زندگی کے خوبصورت پہلوؤں کو نمایاں کریں آؤ اپنے قول و فعل کا تضاد دور کریں آؤ کہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی۔ ع...آغوشِ گلِ کشودہ برائے وداع ہے۔ ***

آبلہ پا

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

سر آپ یقین کریں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ نہیں سر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تو پھر میں کیا کروں۔ سر آپ یہاں سے چلے جائیں۔ پر کیوں؟ سر میری اماں کہا کرتی تھی کہ ان پرندوں کی نظریں بڑی تیز ہوتی ہیں یہ آنے والے حالات کا جائزہ بڑی جلدی لے لیتے ہیں۔ تو پھر؟ جناب میں دیکھ رہا ہوں پرندوں اس علاقے سے بڑی تیزی سے ہجرت کر رہے ہیں۔ یقیناً کچھ ہونے والا ہے۔ دیکھو خیر دین تم جانتے ہو ہم یہاں کروڑوں کا بزنس کرنے والے ہیں اور تم ہو کہ اتنی کم عقلی کی باتیں کر کے مجھے یہاں سے جانے کا کہہ رہا ہے ہو۔ سر آپ میرا یقین... بس جاؤ تم اور ہاں وہ بزنس ڈیلینگ کے لیے جلدی سے رحمان صاحب کا بلاؤ۔ سر آپ میری... کیا سر سر لگا رکھی ہے جاؤ بھی۔ سر... سر... سر مگر اس بار اس کی آواز دبی رہ گئی۔ پورا علاقہ دھماکوں کی زد میں آ چکا تھا اب صرف بارود کی بو پھیلی تھی اور ملبے کا ڈھیر۔ پورا علاقہ پرندوں سے خالی ہو چکا تھا شاید پرندوں نے بارود کی بو پہلے سونگھ لی تھی...

اے عندلیب چل کہ چلے دب بہار کے

نامور شاعر ''منیرؔ نیازی صاحب

بیسویں صدی میں اردو اور پنجابی زبان کے اہم ترین شاعروں میں شمار، منفرد لب و لہجے کے نامور شاعر''منیرؔ نیازی صاحب'' کا یومِ ولادت..نام محمد منیر خاں اور تخلص منیرؔ ہے۔ ۹/اپریل ۱۹۲۸ء کو خان پور، ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں بی اے کیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ مختلف اخبارات اور جرائد سے وابستہ رہے۔ فلمی نغمہ نگاری کی۔ غزل ان کی بنیادی شناخت ہے۔ پابند اور آزاد نظمیں بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں۔ نثری نظمیں بھی لکھتے تھے۔ پنجابی کے بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ وہ اردو اور پنجابی کے ۳۰ سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ اردو شاعری کے چند مجموعوں کے نام یہ ہیں: 'تیز ہوا اور تنہا پھول'، 'جنگل میں دھنک'، 'دشمنوں کے درمیان شام'، 'ماہِ منیر'، 'اس بے وفا کا شہر'، 'چھ رنگین دروازے'۔ ان کو یکجا کر کے ''کلیاتِ منیر'، 'غزلیاتِ منیر'، اور 'نظمِ منیر'، چھپ گئی ہے۔ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ انہیں اکادمی ادبیات پاکستان کا 'کمالِ فن' ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں حسن کارکردگی ایوارڈ کے علاوہ دو مرتبہ 'ستارہ امتیاز' سے بھی نوازا گیا۔

مشہور شاعر منیرؔ نیازی: یومِ ولادت پر منتخب اشعار بطور خراجِ عقیدت

اپنی ہی تیغ ادا سے آپ گھائل ہوگیا
چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہوگیا

خمارِ شب میں اسے میں سلام کر بیٹھا
جو کام کرنا تھا مجھ کو وہ کام کر بیٹھا

غیروں سے مل کے ہی سہی بے باک تو ہوا
بارے وہ شوخ پہلے سے چالاک تو ہوا

غم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
تو نے مجھ کو کھو دیا میں نے تجھے کھویا نہیں

کل میں نے اس کو دیکھا تو دیکھا نہیں گیا
مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی بہت غم سے چور تھا

(بحوالہ: پیمانہ غزل (جلد دوم)، محمد شمس الحق، صفحہ: 221 پیشکش: اعجاز زیڈ ایچ)

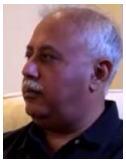

کرہِ ارض ضروری مرمت کیلئے بند ہے

وسعت اللہ خان کے قلم سے

جس کھڑکی کے قریب بیٹھ کر میں لکھائی پڑھائی کا کام کرتا ہوں، اسی کھڑکی کے باہر کونے میں چڑیا نے آج اپنا گھونسلہ مکمل کر لیا۔ اس کی آٹھ، نو سہیلیاں اور ایک طوطا مبارک باد دینے آئے ہیں۔ ایک چہچہاتی ہاؤس وارمنگ پارٹی چل رہی ہے۔ حالانکہ یہ سب مجھے دیکھ رہے ہیں مگر ان کی چُوں چُوں اور ٹیں ٹیں میں کوئی وحشت نہیں۔ ویسے بھی کمرے میں مقید جاندار سے کسی کو کیا ڈرنا۔ فیض صاحب جب تخت گرا رہے تھے اور تاج اچھال رہے تھے یا پھر 'وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے ہم دیکھیں گے' لکھ رہے تھے تو انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہ نظمیں انسان کے سوا کرہِ ارض کے ہر جاندار اور تازہ ہوا کو ترستے آسمان کا ترانہ بن جائیں گی۔ پچھلے دو، تین ماہ سے جو ہو رہا ہے شاید اس زمین پر پہلے کبھی نہیں ہوا۔ جسے ہم ترقی کا کارخانہ سمجھ رہے تھے اس کے پہیے کو ایک نادیدہ دشمن نے روک دیا۔ دو سو سے زائد لکیریں جو انسانوں کو روکنے کے لیے پاسپورٹ اور ویزے کے 'سپیڈ بریکرز' بنا کر اس زمین پر کھینچی گئی تھیں یکلخت بے معنی ہو گئیں۔ کیا امریکہ، کیا صومالیہ اور کیا مکہ، ہر دوار، ویٹیکن اور کیا دیوارِ گریہ، سب ایک ہی صف میں کان پکڑ کر کھڑے کر دیے گئے۔ سنتے آئے تھے کہ جاگیردار کو جب کسی معزز حریف کی عزت خاک میں ملانا ہوتی تو گاؤں کے سب سے نچلے راندہِ درگاہ شخص سے سرِ عام جوتے لگواتا تھا تاکہ یہ قصہ نسل در نسل یاد رہے۔ آج فطرت ایک گھٹیا وائرس کے ہاتھ میں جوتا پکڑا کر اشرف المخلوقات کا وہی حشر کر رہی ہے اور جسے جوتا پڑ رہا ہے وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کا مستحق نہیں۔ سنا ہے اب تک عالمی سٹاک مارکیٹ میں ڈھائی سے تین ٹریلین ڈالر پانی ہو گئے۔

جانے ان تین ٹریلین ڈالرز میں سے کتنی رقم ایمان داری سے کمائی گئی ہو گی اور کتنا پیسہ کتنے لوگوں کا خون چوس کر، کتنے کروڑ درخت کاٹ کر، کتنے لاکھ ایکڑ زمین ریپ کر کے، کتنے بچوں کا دودھ اور نوالہ چھین کر، کتنی ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ کر کے، کتنا سود وصول کر کے اور کتنی محنت سے کرپشن کر کے جمع کیا گیا۔ آنے والے دنوں میں سٹاک ایکسچینج اور اجناس کی منڈی کے ساتھ مزید کیا ہونے جا رہا ہے؟ سب وقت کی دیوار پر لکھا ہے۔ جس دنیا کے آدھے وسائل اور دولت ایک سو انسانوں یا ان کی کمپنیوں کے قبضے میں ہوں ایسی جنتِ شداد کیسے کسی دیدہ و نادیدہ دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن سکتی ہے۔ ایک ایک انچ زمین کے لیے لاشیں بچھا دینے والے، ایک دوسرے سے خوفزدہ ہو کر اسلحے کے انبار لگانے والے اور ہر ہاتھ میں بندوق پکڑا دینے کے خواہش مند، ایک دوسرے کی منڈیاں اغوا کرنے والے منصوبہ ساز، اپنے عقیدے اور اقدار کو دوسرے پر تھوپنے اور انکار کی صورت میں بستیاں تاراج کر دینے والے، جنگلی حیاتیات کو بے گھر کرنے والے، ترقی و خوشحالی کے سراب کے اسیر ہو کر فطری بقا کے بنیادی اصولوں کی دھجیاں اڑانے والے اور اپنے طبقاتی، مذہبی، ثقافتی تحفظ کے دھوکے میں دیواریں بلند تر کر کے ان کے پیچھے چھپنے والے اور اپنے سمیت ہر مخلوق کو ادنیٰ و برتر میں بانٹنے والے۔ آج ان سب کے مکھیا کہہ رہے ہیں کہ اگر دو ڈھائی کروڑ لوگوں کی قربانی لے کر بھی یہ وائرس ٹل جائے تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سمجھنا کہ سودا برا نہیں۔ مجھے ہرگز ہرگز اپنی جاتی کے بارے میں خوش گمانی نہیں کہ جو بچ گئے وہ اپنے لچھن ٹھیک کر کے 'بندے دے پتر' بن جائیں گے اور کرہِ ارض پر دیگر حیاتیات و نباتات و معدنیات کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ کر لیں گے۔ میری جاتی اس وقت جتنی مظلوم ٹپائی دے رہی ہے دراصل اس سے کہیں زیادہ ظالم ہے۔ فی الحال تو میں اپنی کھڑکی کے باہر آدمی کے خوف سے آزاد گھونسلہ بنانے والی چڑیا اور اس کی اچھلتی پھدکتی ہمجولیوں کی چہچہاتی خوشیوں میں مگن ہوں اور اس کھڑکی بھر آسمان کو جی بھر کے دیکھ رہا ہوں جو جانے کب سے خالص نیلا دکھنے کے لیے ترس رہا تھا۔ کرہِ ارض اس وقت ضروری مرمت کے لیے بند ہے۔ میرے مقید ہوئے بغیر یہ بھلا کہاں ممکن تھا؟

معروف شاعر ''عبدالحمید عدمؔ صاحب

10 اپریل 1910ء مقبول عام شاعر، مقبول عوام غزل گو شاعر، زندگی اور محبت پر مبنی رومانی شاعری کے لیے معروف شاعر ''عبدالحمید عدمؔ صاحب'' 10 پریل 1910ء کو تلونڈی، موسیٰ خاں ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور اکاؤنٹس افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں ملک سے باہر بھی رہے۔ نظم، غزل، قطعہ میں طبع آزمائی کی، لیکن غزل سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ عدم ایک مقبول عوام غزل گو شاعر تھے۔ ان کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ چند نام یہ ہیں: 'خرابات'، 'چارہ درد'، 'زُلفِ پریشاں'، 'سرو سمن'، 'گردشِ جام'، 'شہرِ خوباں'، 'گلنار'، 'عکسِ جام'، 'رم آہو'، 'بط مے'، 'نگارِ خانہ'، 'سازِ صدف'، 'رنگ و آہنگ' 10 مارچ 1981ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

جستہ جستہ

عطاء القادر طاہر

جوش ملیح آبادی کے لکھے ہوئے ایک مضمون سے ایک اقتباس با اختصار:

''جالب دھلوی'' اگر کوئی شخص معلومات عامہ حاصل کرنے کی دھن میں کامل ساٹھ برس تک اس روز زمین کے تمام کتب خانوں کو کھنگال چکنے کے بعد فقط ساٹھ منٹ ان کی ہم نشینی سے دو چار ہو جاتا تو اس کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ (وہ ابھی بھی بہت کچھ نہیں جانتا جو اسے جاننا چاہیئے) ایک روز وہ کسی حلوائی کی دکان پر کھڑے ہوئے تھے کہ شوکت تھانوی پہنچ گئے۔ انہوں نے پوچھا ''کیا خرید رہے ہیں؟'' کہا ''حلوہ سوہن'' اور گنوانے لگے حلووں کی اقسام۔ اتنی اقسام بتائیں کہ حلوائی دنگ ہو کر ان کا منہ تکنے لگا اور لکھنؤ کے بے فکرے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ جب اقسام گنا چکے تو بتایا کہ حلوہ سوہن کی ایجاد اس مقصد سے ہوئی تھی کہ خالص گھی سے اُمراء کی ضیافت کی جائے۔ اس کے بعد حلوہ سوہن کے موجد بنانے والوں کے نام اور ان کی دکانوں کا بھی بتا دیا۔ حلوائی دکان سے اتر پڑا اور کہا کہ یہ حلوہ آپ کی نذر ہے۔ میں دام نہیں لوں گا۔ گرد و پیش کے لوگ اس طرح داد دینے لگے کہ گویا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

مبارک احمد عابد: دنیا میں کامیاب جوڑا صرف جرابوں کا ہے ہیکہ ایک کے بنا دوسرا ادھورا ہوتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ: مجھ میں اور میری بیوی میں بڑا عجیب سا اتفاق ہے۔ نیند کی گولیاں وہ کھاتی ہے اور سکون مجھے ملتا ہم اتنے امن پسند ہیں کہ ہمارے سب سے بڑے اخبار کا نام جنگ ہے۔

مشتاق احمد یوسفی: پاکستان میں کھانے کا ادب صرف سربراہوں اور وزیروں کو آتا ہے۔ وہ خاموشی سے کھاتے ہیں!!

انور مقصود: دنیا میں سب سے زیادہ سچ شراب خانے میں شراب پی کر بولا جاتا ہے۔ اور دنیا میں سب سے زیادہ جھوٹ عدالتوں میں مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر بولا جاتا ہے!!

منٹو: حساب اگر جج سے مانگو تو توہین عدالت اگر مولویوں سے مانگو تو کافر اور اگر جرنیل سے مانگو تو غدار...!

اقوالِ زرّیں

آفتاب احمد شاہ

- اعتماد کی سیڑھی پر چڑھنا بہت مشکل کام ہے ہر زینہ عمل کا خراج مانگتا ہے اور جو لوگ بے عملی اور دھوکے کا لباس پہن کر اس سیڑھی پر چڑھ جاتے ہیں وہ وقتی طور پر اپنا مقصد تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن جب اعتماد کی عمارت زمین بوس ہوتی ہے تو ایسے لوگ نظروں سے ہی نہیں گرتے بلکہ دل سے بھی اُتر جاتے ہیں۔

- ایک وقت آتا ہے جب انسان سوچتا ہے کہ زندگی بے سود گزر گئی کاش ایسا ہو جاتا تو ویسا نہ ہوتا یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو محبت کو مذاق سمجھتے ہیں جو رشتوں کی توہین کرتے ہیں جو انسانوں کو وقت گزارنے کیلئے استعمال کرتے ہیں ایسے لوگ زندگی میں صرف ایک چیز حاصل کرتے ہیں اور اسکا نام پچھتاوا ہے اپنوں کا خیال رکھیں کہیں ایسا نہ ہو زندگی میں صرف کاش رہ جائے۔

- قدرت کبھی بھی انتقام نہیں لیتی بلکہ انتباہ کرتی ہے اگر وہ انتقام پر آمادہ ہو تو کسی کا بھی بچنا محال ہو جائے اس لیے زلزلہ ہو یا سیلاب ہو کوئی بیماری ہو یا وبا ہو سب عارضی طور پر ہوتی ہیں اس کے بعد زندگی دوبارہ رواں ہو جاتی ہے لیکن دردناک حقیقت یہ ہے کہ یہ انتباہ کبھی بھی سخت دلوں اور بے شرموں کو جھنجھوڑ نہیں سکا۔ ورنہ وہ سجدوں کو اتنا طویل کرتے کہ زمین اور آسمان کی سنگت آسان ہو جاتی۔

- ائنات اپنے رازوں کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے لیکن اس کی ہتھیلی کو دیکھنے والی آنکھ ظاہر میں اُلجھ کے رہ گئی ہے زندگی کے گرد و غبار میں چھپی چیزیں عیاں لگتی ہیں اور عیاں چیزیں اپنے اندر راز رکھتی ہیں لیکن وہ آنکھ نہیں ہے جو اس کو سمجھے اس سمجھ کے لیے عقل، عقل کیلئے دلیل اور دلیل کے لیے تجزیہ درکار ہے جو کم از کم ہماری اندھی عقیدت پیدا نہیں ہونے دیتی۔

- س طرح جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اسی طرح جھوٹ بولنے والے کے پاس ضمیر نہیں ہوتا۔ ایسا شخص اپنے سچ کا ڈھنڈورا ضرور پیٹتا ہے لیکن حقیقتِ حال سے وہ خود بھی آگاہ ہوتا ہے۔ تبھی باضمیر سولی پر بھی سچ کا کلمہ پڑھتا ہے لیکن بے ضمیر رشتوں کا کاسودا اپنے جھوٹ کی منڈی میں سرِ عام کرتا ہے اور شرمندہ بھی نہیں ہوتا۔

- تکبر وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں میں اور صرف میں ہی ہوں کا فرق ختم ہو

جاتا ہے میں وہم کا وہ نقطہء آغاز ہے جو تو کے وجود پر حملہ آور ہوتا ہے لیکن بجائے اسکے وہ تُو کو جھکا سکے وہ ہمدردی اور انا کا گلا گھونٹ دیتا ہے یہی میں جب حاصل کی دوڑ میں اپنے پرائے کا فرق ختم کرتا ہے تو غرور کا پہلا زینہ طے کر لیتا ہے۔تکبر ایک دن میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ دیمک کی طرح انسانی خوبیوں کو چاٹتا رہتا ہے اور دمِ آخر صرف تکبر بچتا ہے۔

- صبر کا پھل بعض اوقات انسان کو بے صبری پر آمادہ کر دیتا ہے اور انسان اپنی جلد بازی میں وہ کھو دیتا ہے جس کی جستجو ہی اسے صبر پر منتج کرتی ہے انتظار اور امید اس پھل کا اصل روپ ہیں لیکن اس کا ذائقہ لاجواب ہے بیمثال ہے اور دنیا کے تمام میٹھے پھل بھی اسکے سامنے ہیچ ہیں۔جب یہ حاصل ہو جائے تو گزرا وقت اور مشقت کی تکلیف بھول جاتی ہے۔صبر کرنا سیکھیں کیونکہ صبر زندگی و آخرت کا پھل ہے۔

- بیمار ذہنیت کے لوگ معاشرے میں بدامنی کا سبب بنتے ہیں جنکو ہر چیز میں برائی کے عناصر مل جاتے ہیں اگر اتنی محنت وہ خود کو جاننے میں لگا دیں تو ممکن ہے برائی کا مرکز بدل جائے۔

- گلے شکوے سوچ کر کرنے چاہئیں ربِ کائنات نے ہر چیز میں توازن رکھا ہے خوشی اور دُکھ کا پیمانہ یکساں ہے لیکن دکھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔جو لوگ دوسروں کے لیے جیتے ہیں انکے دکھ اپنے دامن میں سمیٹتے ہیں ان کی زندگی میں دکھ کا دورانیہ بہت کم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ لوگوں کی خوشیوں میں اتنے خوش ہوتے ہیں کہ اپنے دکھ بھول جاتے ہیں۔

- قصد کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اس کو اتنا غیر معمولی بنا لیں کہ ساری دنیا اس میں نظر آنی شروع ہو جائے تب ناممکن بھی ممکن ہو جائے گا۔

- لاعلمی بھی بعض اوقات نعمت سے کم نہیں ہوتی۔کیونکہ بعض چیزوں کا علم وہم میں ڈال دیتا ہے اور وہم وبالِ جان بن جاتا ہے اس لیے معلومات ضرور رکھیں لیکن وہ معلومات جو دماغ کو ہلا کے رکھ دیں اور زندگی میں بے چینی پیدا کریں ان سے دوری ہی بہتر ہے۔

- برداشت وہ چیز ہے جو رشتوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے لیکن غیرت اور برداشت آپس میں متضاد کیفیات کی حامل ہیں اگر غلط بات صحیح موقع پر برداشت کی جائے تو بزدلی بن جاتی ہے اور اگر درست بات غلط انداز سے سمجھ کر غیرت کا استعمال کیا جائے تو فساد ہوتا ہے اس لیے صبر کا دامن تھام لیں تمام جذبے اسی کے تابع ہو جائیں گے۔

- دوستی ایک ایسا جذبہ ہے جو صرف محبت سے نہیں جڑا بلکہ احساس اور قربانی اس کا بنیادی فلسفہ ہے کہتے ہیں مشکل میں دوست کی پہچان ہوتی ہے لیکن اگر دوست سچا ہو تو مشکل آنے ہی نہیں دیتا اور اگر آجائے تو اپنے قدم پیچھے ہونے نہیں دیتا۔جس طرح دل کے بغیر جسم بے معنی ہے اسی طرح زندگی سچے دوست کے بغیر اُدھوری ہے۔آج کا دن دوستی کے نام۔

- قدرت نے انسان کو ماحول میں جذب ہونے اور ماحول کو بدلنے کی بیمثال صلاحیت عطا کی ہے۔جب زمین جانوروں سے بھری تھی تب انسان ان میں رہ کر جیتا تھا جب آگ سے آگاہ نہ تھا تب بھی زندہ رہا جب ترقی سے آگاہ نہیں تھا تب بھی جینے کا ہنر رکھتا تھا ڈارک ایج سے ایڈوانس ایج تک مر کے جینے کا عزم دکھاتا رہا۔آزمائش انسان کو سکھاتی ہے لیکن ان لوگوں کو جو جینا چاہتے ہیں بزدل اور ڈرپوک من گھڑت افواہوں سے تب بھی مرتا تھا اب بھی مرتا ہے۔اگر آپ جینا چاہتے ہیں تو زندگی کے اسباق سیکھیں ورنہ موت تو جانوروں کو بھی آنی ہے۔

- عبادات میں اللہ تعالیٰ نے توازن رکھا ہے کسی عبادت میں کمی نہیں اور کسی میں تھکن نہیں ہے یہ ایسا توازن ہے جو انسان کو صرف کسی ایک عبادت پر مجبور نہیں کرتا۔اگر نماز فرض ہے تو سچ نماز کا اثاثہ ہے ایمانداری نماز کا عمل ہے احساس،صداقت،کردار یہ سب وہ خوبیاں ہیں جو توحید،نماز،روزہ،زکوٰۃ،حج کی شان ہیں یہ اگر نہیں تو کیا خالی نماز،روزہ فائدہ دے گا؟ اسکا مطلب یہ ہوا حقوق العباد اور حقوق اللہ ہی انسانی کردار کو سنوارتے ہیں۔

- حبتیں وہی دیرپا ہوتی ہیں جہاں تجارت کا گمان نہیں ہوتا۔ایک محبت کرنے والا کبھی تو ایک مسکراہٹ پر راضی ہو جاتا ہے اور کبھی تلخ بات کو بھی سرما یہ حیات بنا لیتا ہے۔عشق کا جہاں اس لیے بھی انوکھا ہے کیونکہ یہاں عقل کا دخل نہیں اور جہاں عقل کارفرما نہ ہو وہاں تحیر کی کارفرمائی چلتی ہے۔

- اصل بات یہ نہیں ہے کہ ہم سنوارنا چاہتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہمیں خوف کی حالت میں خدا یاد آتا ہے۔رمضان میں مہنگائی کون کرتا ہے؟ ذخیرہ اندوزی کون کرتا ہے؟ بدعنوانی کے پیسے سے بننے والے مکانات پر ھذا من فضل ربی کون لکھواتا ہے؟ گھٹیا اور دو نمبر مال کون بیچتا ہے؟ لوٹ مار کے نئے نئے طریقے کون ایجاد کرتا ہے؟ سات سات حج کرنے کے بعد بھی تجارت میں جھوٹ کون بولتا ہے؟ نہیں جناب ہم سدھرنا نہیں چاہتے بس ڈر کر اپنی چھتوں پر چڑھے ہیں سچ کی آگ میں مومن کبھی جلتا نہیں اور منافق کا ڈر

اورخوف جاتا نہیں۔

- ہمیں اپنے کرتوت درُست کرنے پڑیں گے نہ کہ ہر بات کا الزام دوسروں پر دھر دیں۔کوئی کہتا ہے خدا ناراض ہے نعوذ باللہ خدا کوئی انسان کی طرح ہے جو بات بات پر ناراض ہوجاتا ہے؟ وہ تو رحیم ہے وہ تو رحمان ہے۔وہ تو بخشنے والا ہے اور چند دن بعد جب وباء ختم ہوگئی ہماری سرگرمیاں کیا ہونگی؟ کوئی کہتا ہے قیامت آنے والی ہے تو بھائی تم نے کیا تیاری کی قیامت کی؟ تم بس لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہو۔کسی کو وہم ہوگیا ہے یہ کسی کی سازش ہے۔ان افواہوں کے بازار میں کوئی نہیں سوچتا یہ سب وہ ہے جو ہم نے بویا ہے اب کاٹنے کا وقت ہے۔اگر آپ خود معصوم سمجھتے ہیں تو خدارا خود کی حفاظت سے پہلے اپنے خاندان کی حفاظت کیجئے گھر رہیں احتیاط کریں۔ ٹی۔وی اور سوشل میڈیا سے دور رہیں۔

- یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے اس ملک میں ہر آدمی ڈاکٹر ہے حکیم ہے مذہبی عالم ہے فلسفی ہے استادِ کل ہے تبصرہ نگار ہے تنقید نگار ہے افواہ کار ہے دوسروں کی تکلیف کی تشہیر کرنے والا ہے اگر نہیں ہے تو ایک اچھا شہری، قانون پر عمل کرنے والا فرد، سچا پاکستانی، حکومت کی بات ماننے والا امن پسند انسان۔ حیرت کی بات تو یہ ہے ہم اپنوں کی تکلیف کا ہی مزہ لینا چاہتے ہیں لیکن خود اس تکلیف سے بچنا چاہتے ہیں اور اپنا صرف خون کا رشتہ نہیں ہے وہ بھی اپنا ہے جو مسلمان ہے جو پاکستانی ہے جو انسان ہے۔لوگوں کا مذاق اُڑانے کی بجائے اپنے گھر پر ہونے والی دستک سے بچیں۔

- ہالت ایک بیماری کی مانند ہے جو کسی کو بھی ہوسکتی ہے بعض پڑھے لکھے بھی شعور سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔انکی جہالت کا منبع آج کل کے وہ پیغامات ہیں جو سوشل میڈیا کے خودساختہ ارسطو اور افلاطون اپنی دماغی مشینوں سے ایجاد کرتے ہیں۔اور آفرین ہیں ان لوگوں پر جو ان کو سچ مان کر نہ صرف پریشان ہوتے ہیں بلکہ عمل بھی خوب کرتے ہیں۔تحقیق کا مادہ شاید ہماری قوم کا خاصہ ہی نہیں۔خدارا خبر کی تحقیق کرلیا کریں ممکن ہے آپ کی غلط خبر سے کسی کا گھر برباد ہوجائے۔

***

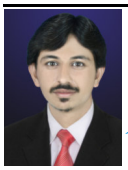

نئی حکومت

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

ماں اپنے ہاتھوں سے بیٹے کو روٹی کھلا رہی تھی۔ ماں ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے نئی حکومت آنے والی ہے تو ملک میں بہت جلد تبدیلی آجائے گی۔ماں نے جب یہ سنا تو فوراً بیٹے کی بچی کھچی روٹی کو کپڑے میں باندھ کے چھپا کے رکھنے لگی۔...

لڑکھڑاتی مسکراہٹ۔

بسمِ اللہ کلیم

میں لاہور جارہا تھا راستے میں گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر رک گئی۔اخبار میں مگن میں اُس کی آواز پر چونکا بابُو جی گاڑی میں کچھ خرابی ہوگئی ہے کچھ دیر لگے گی آپ کے لیئے کچھ چائے پانی لے آؤں؟ شائستہ لہجے میں اُس نے پوچھا بہت شکریہ میں ابھی اتر کر دیکھتا ہوں۔مُجھے کچھ بھوک بھی محسوس ہورہی تھی۔پریشانی اور اُکتاہٹ کے باوجود جواب کے ساتھ میرے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ بلاشبہ اس کے نرم اور شائستہ لہجے کی مرہون منت تھی۔ کچھ تو منفرد تھا اس بظاہر سادہ اور معصوم نظر آنے والے نوجوان میں...!جی بابُو جی میں یہاں سٹیشن ماسٹر جی کے ساتھ ہی ہوتا ہوں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو پوچھ لیجیئے گا مُسکرا کر وہ آگے چل دیا۔اُس کی ایک ٹانگ میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ میں نے دیکھا لڑکھڑاہٹ کے باوجود تیزی سے ادھر اُدھر بھاگتا یکے بعد دیگرے سب مسافروں سے چائے پانی پوچھتا ہنستا مسکراتا وہ سب کی خدمت میں مصروف تھا۔میں ریل گاڑی سے اتر کر سامنے بنے چھوٹے سے مسافر خانے کی طرف کو چل دیا۔سٹیشن ماسٹر صاحب ٹانگ پر ٹانگ دھرے کرسی پر نیم دراز خراٹے لے رہے تھے۔معاف کی جیئے گا نماز پڑھنا چاہتا ہوں کوئی غُسل خانہ یا وضو وغیرہ کا انتظام ہے یہاں؟ میرے پوچھنے پر بوکھلا کر اٹھے ایک دم زوردار آواز دی''اوئے لنگڑے کدھر مر گیا ہے اِدھر آ...!''ابھی آیا صاحب جی میں نے آواز کی سمت دیکھا وہ ایک بزرگ خاتون کو سہارا دے کر بینچ پر بٹھا رہا تھا۔اُن کا سامان ان کے پاس رکھ کر بولا گھبرانا نہیں امّاں جی ریل گاڑی چلنے سے پہلے میں آپ کو خود آکر سوار کروادوں گا۔امّاں جی کی مُٹھی میں دبے روپے محبت سے لوٹاتا انہیں تسلیاں دیتا دعائیں بٹورتا بھاگا چلا آیا۔ ٹانگ کی لڑکھڑاہٹ اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں تھی۔جی صاحب جی اب بتائیں؟ بابُو جی کو مسجد لے جا۔اور سن...! اوئے صفائی کی تھی مسجد کی آج؟ ہنس کر بولا...!''جی جی ماسٹر صاحب کیسے نہ کرتا بھلا یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے''مخمل سی نرم ہوا مُجھے چھو کر گزری آسمان نے کسی کی نظر اُتاری ہو جیسے...! چاند کبھی کبھی تاروں کے علاوہ بھی کسی کی بلائیں لیا کرتا ہے شاید...!چلیئے بابُو جی وہ ابھی گاڑی ٹھیک ہونے میں کچھ وقت ہے آپ آرام سے مسجد میں نماز ادا کرلیجیئے۔چاہیں تو کچھ دیر آرام بھی کرلیں۔چھوٹی سی مسجد تھی صحن میں رکھے گھڑوں میں تازہ ٹھنڈا پانی بھرا تھا۔صاف ستھرا غُسل خانہ میرا دِل خوش ہو

گیا۔ نماز ادا کرنے کہ بعد میں نے سلام پھیرا پچھلی صف میں وہ نوجوان بھی نماز ادا کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے سکون نے ایک بار پھر مُجھے حیران کر دیا میرے دِل نے بیاختیار دنیا اس کے چہرے میں ڈھل جانے کی خواہش کی صبح سویرے چڑیوں کی حمد بھری چہچہاہٹ اندھیرے سے پھوٹتی سورج کی پہلی نرم کرن تپتی دوپہر کی رات پر چمکتا چاند کس سے تشبیح دوں عجیب تھا وہ ماں کی تسبیح جیسا نوجوان میں سوچ کر مُسکرایا۔ سٹیشن ماسٹر صاحب ابھی تک سو رہے تھے۔ ریل گاڑی ٹھیک ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی یہاں کچھ کھانے کو ملے گا ماسٹر صاحب آپ بیٹھیئے ابھی وہ لنگڑا آتا ہے تو آپ کے لیئے کچھ لا دیتا ہے۔'' سُبحان اللہ، سبحان اللہ'' سامنے بیٹھی اماں جی تسبیح کر رہیں تھیں۔ اتنے میں وہ لنگڑا بھاگا چلا آیا کچھ ہی دیر بعد گرما گرم سموسے اور مزیدار چائے میرے آگے رکھتے ہوئے بولا۔'' اور کوئی خدمت بابُو جی''۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے میں نے کہا اپنی یہ لڑکھڑاہٹ مُجھے دے دو...! میری آنکھوں سے گرتے آنسو چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے'' مجھے اور میری دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔ مسافر خانے کی کھڑکی سے نظر آتے خراٹے لیتے سٹیشن ماسٹر صاحب سمیت۔

آپا کی سلائی مشین

تحریر مُبشرہ ناز

زہر لگتی تھی مجھے آپا کی سلائی مشین۔ آپا، برآمدہ اور سلائی مشین۔ جب سے ہوش سنبھالا تینوں کو اکٹھے دیکھا۔ آپا مجھ سے دس سال بڑی تھی۔ ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ بڑی محبت سے بیاہ کر لے جانے والے نے تیسرے سال ہی دوسرا بیاہ رچا کر آپا کو طلاق دے دی تھی۔ اللہ کی رضا میں راضی چُپ چاپ، لب سیئے آپا واپس چلی آئی۔ اگلے ہی دن اماں کے جہیز کی مشین سٹور سے نکالی۔'' سلائی کروں گی۔ ابا پر بوجھ نہیں بننا مجھے'' کملی جانتی نہیں تھی دو وقت کی روٹی کہاں بھاری تھی ابا پر، اُن کے سینے پر تو اُس کی چھوٹی قسمت کی بھاری سل دھری تھی۔ جو سانسوں کے آنے جانے میں رُکاوٹ بنی رہتی۔ نتیجہ فالج کی صورت نکلا۔ ابا کی حالت کا ذمہ دار خود کو ٹھہراتے، آپا برآمدے میں خاموش بیٹھی سلائی کا کام کرتی اپنی چُپ سے جانے کیا دُکھ سُکھ کرتی رہتی۔ یوں تو آنکھوں پر پلکوں کے گھنے پردے گرے رہتے مگر کبھی کبھی آنکھ کی آہ و بُکا سے گھبرا کر اچانک ایک ننھا قطرہ سلائی مشین پر گرتا۔ شاید وہی تھا جو بچپن کو انمول کر جاتا اور معمولی سے کپڑے کو خاص۔ اُتنا خاص جتنی عام میری آپا تھی۔ دیکھتے دیکھتے سلائی کا کام بڑھتا گیا۔ برآمدہ چھوٹے سے سلائی اسکول میں بدلا اور آپا ابا کا بیٹا بن گئی۔ بڑی بڑی بیگمات کے کپڑے سلائی کیلئے آتے۔ سب کو آپا کے ہاتھ کی سلائی چاہیئے تھی قیمت چاہے کچھ بھی ہو۔ ایک بار ایک بیگم کے تعریف کرنے پر میں نے آپا کے تُرپائی کرتے ہاتھوں سے قمیض پکڑ کر کہا،'' آپا دکھاؤ تو سہی ایسا کیا جادو ہے تمہاری سلائی میں''؟ ترپائی تھی کہ انگلیوں نے روح کے پوروں سے قمیض کے دامن پر الم لکھے تھے۔ قطار در قطاریوں ٹانکے بھرے تھے اینٹوں کی دیوار ہو جیسے۔ اُس دیوار میں میری آپا چنوائی گئی تھی۔ اُن ٹانکوں کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ اُس رات میں نے پہلی بار آپا کے دکھ کو محسوس کیا۔ میں شاید بڑا ہو گیا تھا۔ اُس رات بھی آپا دیر تک سلائی کرتی رہی۔ ساری رات مشین چلتی، روتی اور گاتی رہی'' محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے'' اچانک سلائی مشین اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی ہمدرد غمگسار۔ اُس رات پہلی بار سلائی مشین کی آواز میں بھرا دُکھ سُن پایا تھا میں۔ مشین کے ساتھ میں بھی ساری رات روتا رہا'' محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے'' اگلی صبح میری برطانیہ کی فلائٹ تھی میرا وہاں کی یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تھا۔ آپا سلائی مشین کی سوئی میں دھاگہ نہیں خواب ڈالا کرتی تھی۔ بچیہ کیسے نہ جچتا۔ اُس نے پھٹے پُرانے ادھڑے دُکھوں کو رفو کر کے سپنوں کی ایسی چادر بُنی تھی جس نے ہمارے بیسر و ساماں، سروں پر چھاتا کر دیا۔ میں اپنی آپا کا مقروض ہوں۔ میں اپنی آپا کی سلائی مشین کا مقروض ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ آپ سب کو اپنے والدین کا بازو بن کر اس قرض کو اتارنے میں میری مدد کرنی ہے۔ آپا کے نام پر کھولے جانے والے سلائی سکول کا افتتاح کرتے ہوئے میں رو پڑا۔ وہیل چیئر پر بیٹھے ابا آج بہت خوش تھے۔ وقت نے اچانک آپا کی زندگی کی پتنگ لوٹ لی۔ برآمدہ خالی تھا۔ اور میرے ہاتھوں میں کپڑے کا لمس باقی۔ راتوں کو اب بھی اکثر سلائی مشین گایا کرتی ہے۔'' محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے ایک کہانی مگر مسکراتی ہے۔

ایمانداری

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

پہلے ہی دن سے اُس کی نظر صاحب کی اُس گھڑی پہ تھی جو وہ اکثر غلطی سے میز پر بھول جایا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی ایک عجیب خوف سے وہ اس کو اٹھانے کی زحمت نہ کر سکا۔ پھر ایک دن اس نے دل کو مضبوط کیا اور موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہولے سے اس نے گھڑی کو اپنی جیب میں چھپا لیا۔ اگلے دن جب وہ دفتر پہنچا تو صاحب پریشانی میں اس سے کہہ رہے تھے: تم مجھے بہت محنتی اور دیانت دار لگے میں نے سوچا کہ تمھیں تمھاری محنت اور ایمانداری پہ ایک گھڑی تحفہ دوں گا مگر میری یاداشت کی کمزوری کی وجہ سے وہ گھڑی پتہ نہیں میں نے کہاں کھو دی؟؟؟

سخن فہمی - اے آر خاں

شعراء ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ میں سخن فہمی عالم بالا معلوم شدہ کا نعرہ بلند کرتے چلے آئے ہیں۔اس نعرہ میں تو جھنجھلاہٹ ہے۔لیکن شعراء کے ہاں ایسے اشعار بھی بکثرت ملیں گے جس میں حرماں اور تحسر کا رنگ جھلکتا ہے۔جن کی بنا اَبنائے زمان کی ناقدر شناسی سخن ہے۔اس شکوہ شکایت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے۔فارسی کا کم وبیش ہر بڑا شاعر اس بات کا شاکی نظر آتا ہے کہ لوگ نہ سخن فہم ہیں نہ سخن شناس۔قدردانی ہوتو کس طرح ہو؟۔اردو شعراء کا بھی یہی حال ہے۔میرؔ سادگی میں سہل ممتنع کے مقام تک پہنچتے ہیں۔اس کے باوصف وہ بھی یہی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ سخن فہم نہیں ملتے۔غالبؔ اور بیدلؔ نے تو خیر اس موضوع پر بہت سے اشعار لکھے ہیں۔حالیؔ نے بھی کہہ دیا۔

؎ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

علوم مجلسی پر جن لوگوں نے مشرقی وضع داری اور آداب پر کتب لکھی ہیں۔وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ سخن گوئی آسان ہے اور سخن فہمی مشکل۔یاد رکھیئے کہ غالب نے اپنے دیوان کی اشاعت سے پہلے سخن فہم دوستوں کی ایک مجلس بنائی تھی جس کے رکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی تھے۔انہی کے متعلق غالبؔ نے کہا ہے۔

نہ نو دشت دیواں در غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

غالب کے لئے ایسا کہنا بڑی بات ہے اور شاید اس بات کی دلیل قاطع ہے۔کہ سخن فہمی کا مقام سخن گوئی سے بلند تر ہے۔مجلس مشاعرہ ہو یا کوئی اور محفل،شاعر کی نظریں ہمیشہ سخن فہم کی تلاش میں رہتی ہیں۔سخن فہم کے داد دینے کا انداز اسلوب،رسمی داد دینے والوں سے علیحدہ ہوتا ہے اور شاعر کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کی نظر حسن کلام کی باریکیوں اور اظہار کی نزاکتوں تک پہنچ رہی ہے۔سخن گوئی اس زمانہ میں پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔یوں بھی سخن گوئی کا عمل فنونِ لطیفہ میں سب فنون سے زیادہ پُراسرار،حیرت پرور اور پیچ دار ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ افکار،دل کی واردات،ذہنی تصورات،الفاظ کا جامہ پہننے سے پہلے کئی بار شاعر کی گرفت میں آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔کبھی ردیف مانع اظہار ہوتی ہے کبھی قافیہ۔کبھی وزن کی پابندی،بہرحال تشکیل لفظی سے پہلے سخن گو کو عجیب عجیب منزلوں اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے پہلے وہ اس بات کا شعورِ کامل حاصل کرتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔جب یہ شعور حاصل ہو جاتا ہے تو ایک اُلجھن دور ہو جاتی ہے۔کہ سخن گو کو بقطع ویقین اپنی واردات ذہنی اور ان کی نوعیت کی دلالتوں کا علم ہو جاتا ہے۔لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔اب سخن گو کے سامنے،واردات کے اظہار کے لئے الفاظ کے انتخاب کا مرحلہ ہوتا ہے۔یہ بھی بہت ہی نازک اور پُراسرار مقام ہے۔پہلے تو یہاں شاعر کے مبلغ علم کا امتحاں ہوتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ جو الفاظ اظہار کے لئے موزوں ہوں وہ شاعر کے پاس ذخیرہ الفاظ موجود ہی نہ ہو۔پھر یہ بھی ممکن ہے الفاظ تو ہوں مگر ان کے درست معنی شاعر کو معلوم نہ ہوں۔فرض کریں یہ دونوں تو ہوں مگر ترکیب استعمال کا پتہ نہ ہو۔اس منزل سے گزرا تو وارداتِ ذہنی نے الفاظ کا جامہ ضرور پہنا۔یعنی ذہن میں ابھی شعر وجود میں نہیں آیا۔کیونکہ ابھی یہ منزل باقی ہے کہ الفاظ کی ترتیب اور اور نشست کی کیا صورت ہو۔شعر اصلاً جس سماعت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے دل میں اترنے سے پہلے اسے درگوش پر دستک دینی پڑتی ہے۔

یہ مرحلہ بخوبی طے ہو جائے تو تو معنی تابناک کی عروس شرمگیں حجلہ الفاظ سے جھانکتے ہیں۔جھانکنے کا لفظ میں جان کر استعمال کیا ہے۔عروسِ معانی سے آنکھیں چار کرنا مشکل سے میسر آتا ہے کیونکہ یہ تمام مراحل طے کرنے میں کچھ پہلو تشنۂ اظہار رہ جاتے ہیں۔اور شاعر گویا پھڑکتا رہ جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اپنی پوری کوشش کے باوجود کہہ نہیں پایا۔جس وقت معانی الفاظ میں مقید ہو چکتے ہیں۔تب بھی الفاظ کی نشست اور معانی کی ترتیب بڑے شاعروں کے ہاں ایسی ہوتی ہے۔کہ سننے والا بھی وہ مطلب اخذ کرتا ہے۔جو مجموعہ الفاظ میں موجود نہیں ہوتا۔لیکن جس پر الفاظ کی ایک خاص چیز دلالت کرتی ہے۔مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں الفاظ کی ترتیب پر غور فرمایئے گا۔

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع!
سعادت اسکو کہتے ہیں شہادت اس کو کہتے ہیں

سخن گوئی میں ایک مقام یہ بھی آتا کہ شاعر حقائق بیان کرنے کے لئے تشبیہات و استعارات کا دامن تھامتا ہے۔معمولی تشبیہات و استعارات سے بحث نہیں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہنی واردات کو جو شعر کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہیں دوسرے فنون لطیفہ کی اصطلاحات کے ذریعے سامع تک پہنچایا جاتا ہے۔یہی نہیں سخن گوئی میں کم وبیش ہر بڑا شاعر کرتا ہے۔فرق یہ ہے کہ بعض تلمیحات پیش پا اُفتادہ ہوتی ہیں اور بعض دقیق اور علوم وفنون کی اصطلاحات پر مبنی تلمیحات ہر طرح کی ہوتی ہیں۔طب،ہیت،نجوم،تاریخ،فلسفہ،مذہب،فقہ،معانی شعر کے دام خیال سے کوئی چیز نہیں بچتی۔فارسی میں خاقانی تلمیحات کی دقت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں۔اُردو میں اقبال کے ہاں جس کثرت سے

تلمیحات ملتی ہیں۔شاید اور کسی کے ہاں اس کی مثال نہ ملے۔فلسفہ،حدیث،اور فقہ ان علوم کی طرف اقبال کا خاص میلان ہے۔سخن فہم کا کمال یہ ہے کہ اس کا مطلب دریافت کرے۔جو مقصود شاعر ہے سخن فہمی ان تمام اشارات و رموز کو سمجھنے کا نام ہے جو شاعر نے شعر میں مخفی رکھے ہیں۔یوں سخن فہمی،سخن گوئی سے زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔سخن فہمی کے لئے ذوق سلیم لازم ہے۔ذوق سلیم کچھ مطالعہ کا،کچھ مشاہدے کا،کچھ محفل آرائی کا،کچھ تربیت کا،کچھ ذاتی اور اجتماعی ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس کی انفرادیت یوں قائم رہتی ہے کہ غزل گوئی میں اثرؔ لکھنوی میرؔ پر جان دیتے ہیں۔اور نیازؔ فتحپوری مومنؔ پر۔لیکن نہ تو نیازؔ کو میرؔ کے شاعر ہونے پر انکار ہے اور نہ اثرؔ کو مومنؔ کے ناشاعر ہونے پر اصرار ہے۔ہاں اگر کسی شاعر کے متعلق یہ جھگڑا کھڑا ہو جائے کہ یہ چاعر بھی ہے کہ نہیں اور جو لوگ مسلمہ طور پر ذوق سلیم رکھتے ہیں دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔تو افسوس سے ایک گروہ کو مردود ٹھہرانا پڑے گا کہ شعر یا شاعر کی خوبی میں بھی اختلاف رائے نہیں ہوسکتا صرف پسندیدگی کے مدارج ہو سکتے ہیں۔شعر کی تعبیر میں اختلاف ہوسکتا ہے۔شاعر کے مالی رتبہ ہونے پر بحث ہوسکتی ہے یہ بات کبھی متنازعہ فیہ نہیں ہوسکتی کہ فلاں شعر اچھا ہے یا بُرا۔میں نے عرض کیا تھا کہ سخن فہمی سخن گوئی سے زیادہ مشکل فن ہے۔میرے خیال میں آپ میرے ہم نوا ہوں گے کہ یہ بات غلط نہ تھی سخن فہموں کی تعداد ہمیشہ شعراء کی تعداد سے کم تر رہی ہے اس لئے ان کی بڑی مانگ بھی رہی ہے۔اور شعراء کے نام لے لے کر اپنے دیوانوں میں ان کو سراہا گیا ہے۔

***

ترقی

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

سر میں کامیاب ہوگیا۔اس نے خوشی نے ناچتے ہوئے کہا۔کیا مطلب تمھارا؟ کیا تم اپنے تجربے میں کامیاب ہوگئے؟ جی سر یہ دیکھیں۔ یہ ایسا پروگرام ہے جو دنیا میں کسی بھی جگہ پہ رہنے والے انسان کے متعلق تمام معلومات چند لمحوں میں بتا دے گا۔بلکہ اس کی جسمانی اور طبعی حالت بھی۔کیا بات ہے تم نے تو سائنسی ترقی میں ایک منفرد باب کا اضافہ کیا ہے۔یقیناً تم بہت بڑے انعام کے مستحق ہو۔بس سر یہ سب...اسی لمحے اس کے فون کی گھنٹی بجی۔فون سنتے ہی اس کے چہرے پہ کئی رنگ آئے اور گئے اور دفعتاً فون اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔دنیا کے ہر شخص کی معلومات اکٹھی کرنے والے کی ماں بیٹے کی بے خبری اور بے احتیاطی کی وجہ سے چل بسی تھی۔

مختصر افسانے: محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

اِک خواب جو ٹوٹ گیا

وہ دن بھر کام کرتی تھی۔جب دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد رات کو وہ ٹوٹی ہوئی چارپائی پہ لیٹتی تو اسے لگتا جیسے اس کے نرم و گداز بدن کے نیچے کسی نے سوئیاں پرو دی ہوں۔گو رات کو اس کو کچھ پل ایسے ملتے تھے جن میں اسے تھکاوٹ اتارنے کے لیے کچھ لمحات مل جاتے مگر جب اسے یہ خیال آتا اس رات کے بعد پھر ایک اور دن آنا ہے تو اس کی نیند اُڑ جاتی۔رہ رہ کے وہ اپنی چھوٹی بہن کوکو جو سفید رنگت اور خوبصورت رعنائی کی بدولت سب کے دلوں کی تارا تھی۔گو دونوں کی عمروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا مگر سانولی رنگت اور عام سے نقوش کی بدولت ہر کوئی اس سے ہی کام کرواتا اور کام کے علاوہ کوئی اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا۔ایک دن کام کے دوران ماں اس سے مخاطب ہوئی اور کہا کہ اس کی بہن کا بیٹا بڑی دور سے آ رہا ہے گھر کی صفائی میں کمی نہ آنے پائے کیا پتہ تیری بہن کو پسند کر لے اور ہم جلدی سے اس کے ہاتھ پیلے کر لیں۔یہ سنتے اسے اپنا آپ بہت نیچا دکھائی دینے لگا مگر اس کے باوجود وہ خاموشی سے کام میں جت گئی۔کچھ دن بعد جب وہ لڑکا آیا تو گھر میں جیسے رونق لگ گئی۔گھر کے ہر فرد کی طرف سے اس کی خوب آؤ بھگت ہونے لگی۔مگر صرف وہ ایک تھی جو خاموشی سے اپنے کام کر رہی تھی۔کئی بار جب وہ اپنی بہن کے پاس اس کو بیٹھے گپ شپ لگاتے دیکھتی تو وہ خاموشی سے چائے ان کے پاس رکھ کے فوراً باورچی خانے میں چلی جاتی اور اپنی قسمت کا رونا روتی۔دو دن سے اس نے خوب محنت کی تھی اور اس کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ آنے دی تھی۔اس شام جب وہ چائے دینے گئی تو اس نے پہلی بار کسی کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار دیکھا چاہت دیکھی۔اس نے نے حسبِ معمول چائے رکھی اور پلٹ گئی مگر اسے لگا جیسے اس کی نظریں دیر تک اس کا طواف کرتی رہی تھیں۔

اس رات وہ بڑے سکون سے سوئی۔اور پھر وہ ہو گیا جس کا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔وہ اس کی چارپائی کے پاس پھول لیے کھڑا تھا۔دیکھو پگلی اتنی جلدی سو گئی تم اٹھو اور دیکھو میں تمھارے لیے پھول لایا ہوں۔وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔آ۔۔آ۔۔۔آپ۔یہ پھول میرے لیے ہیں کیا؟ ہاں نا۔پر آپ تو

میری بہن...اسے چھوڑو۔تمھارے آگے اس کی کیا حیثیت۔اور پھر جس طرح سے تم نے دو دن میری خدمت کی اس طرح تو وہ پوری زندگی بھی نہیں کر سکے گی۔اسی لمحے اس کی ماں کی آواز سنائی دی تو وہ چونک اُٹھی۔وہ غائب ہو چکا تھا۔اور وہ پھول...وہ کہیں بھی نہیں تھے وہ نیند سے بیدار ہو چکی تھ اور تو یہ خواب تھا پر کیا پتا اس کی تعبیر بھی...یہ سوچتے ہوئے وہ تیزی سے نیچے بالکونی میں گئی وہ واپس جانے کو تیار تھا اس نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر باورچی خانے میں چلی آئی۔اُسے پیچھے سے آہٹ سنائی دی۔دھڑکتے دل کے ساتھ وہ مڑی تو وہ اسکے سامنے کھڑا تھا،نجانے کس جذبے کے تحت وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے باز رہی۔وہ اسکے جھکے ہوئے سر سے مخاطب تھا،''جس طرح تم نے میری ان دنوں میں بے لوث خدمت کی ہے اس پر میں تمہارا شکر گزار ہوں،''اس کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا مگر ہونٹ خاموش تھے،نہ جانے کیا ہونے والا تھا،''تمہارا یہ خدمت کا جذبہ لائق تحسین ہے،میں شاید ساری عمر تمہارا یہ برتاؤ نہ بھلا سکوں''،شاید کوئی خواب سچ ہونے جا رہا تھا،''مگر مجھے یہ گوارا نہیں کہ میں کسی ایسے کے لیے کچھ نہ کروں جس نے میرے لئے کچھ کیا ہو،میری اتنی خدمت کی ہو''،اس نے پہلی بار سر اٹھا کر اسے دیکھا،''اس لیے تم پلیز یہ رکھ لو''اس نے اس کے ہاتھ میں چند نوٹ تھما دیے،''پلیز...''مگر وہ نوٹ تو ہوا سے کمرے میں بکھر گئے تھے...اس کو لگا کہ وہ میلوں دور سے تپتے صحرا میں چلتی آ رہی ہو۔اس نے اسکی آنکھوں میں جھانکا،مگر وہاں تو ایک گہری خاموشی تھی.ایک عمیق خاموشی،جسے ٹوٹنے کے لئے شاید صدیاں درکار تھیں!!!لگتا تھا اک خواب تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔ہاں اک خواب جو ٹوٹ گیا...اک خواب سا دیکھا تھا جیون میں جب آنکھ کھلی تو ٹوٹ گیا۔

دعوت

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

ایک بہت بڑے گھر میں شاندار دعوت تھی جہاں کئی طرح کے پکوانوں کی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔رات گئے تک رونق میلا لگا رہا۔دستر خوان سجے رہے۔۔۔اگلے دن صبح ہی صبح کئی بچے شاپر اُٹھائے اس گھر کی طرف دوڑے یہ کہتے ہوئے جا رہے تھے۔جلدی چلو کہیں جانور ہم سے پہلے نہ پہنچ جائیں ورنہ بچا کھچا وہ سب خراب کر دیں گے۔۔۔

سپنے

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

جولی!ہاں بولو میک!کل رات میں نے پھر ایک ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے او میک میں نے کتنی بار کہا ہے کہ یوں اوٹ پٹانگ سپنے نہ دیکھا کرو۔پر جولی یہ سپنا کئی بار پہلے بھی آیا ہے تم سنو تو سہی۔ہاں بتاؤ۔کون سا سپنا تھا؟میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے بہت سے لوگ جمع ہیں۔میں لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے پہنچا تو دیکھا کہ خون میں لت پت ایک لاش پڑی ہے اور اس کا جسم جگہ جگہ سے تار تار ہو چکا ہے۔دفعتاً کسی نے اس کا چہرہ سیدھا کیا تو تو...وہ،وہ چہرہ میرا چہرہ تھا۔او میک تم تو یونہی پریشان ہوتے رہتے ہو۔خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ویسے بھی میں تمھارے ساتھ ہوں نا۔اور پھر وہ اس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے چہکتے ہوئے بولی:سنو سڑک کے اس طرف ایک نیا ہوٹل کھلا ہے چلو ادھر چلتے ہیں۔پھر وہ دونوں خوش گپیوں میں ہوٹل کی طرف چل دیئے۔اسی لمحے ان کو پیچھے سے روشنی کا ایک گولہ سا دکھائی دیا اور روشنی تیز اور قریب سے قریب ہوتی گئی۔پھر ایک زوردار دھماکہ...ان کے ہاتھ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔اس نے چلاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔مگر جب اس کو دُھند کے چھٹ جانے کا احساس ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولی۔سامنے میک کا جسم جگہ جگہ سے تار تار ہوا پڑا تھا اور لوگ اس کے اردگرد جمع تھے۔رات کے اندھیرے میں شاید اس گاڑی کی بریک فیل ہو گئی تھی جو اس کو چیرتی ہوئی اس کے خواب کو حقیقت کا روپ دے گئی تھی۔۔

فوزیہ مغل (جرمنی)

دے گئی لذت میری تنہائی کی عادت مجھے
اب شکایت ہے کسی سے اور نہ ہے وحشت مجھے
کھوج میں اپنی نکلنے کا سفر اچھا لگا
لمحہ لمحہ خود کو پانے میں ملی راحت مجھے
میری اپنی زندگی ہے داستاں در داستاں
قصّے اوروں کے پڑھوں میں اب کہاں فرصت مجھے
خود پرستی خود ستائی مجھ کو دنیا سے ملی
جابجا ڈھونڈے گی میرے نام سے شہرت مجھے
فوزیہؔ اس دل میں پنہاں ہیں تلاطم خیزیاں
مار ڈالے نہ کہیں جذبات کی شدت مجھے

آئینہ

محمد نعیم یاد جوہر آباد خوشاب

وہ دونوں اخلاقیات کے موضوع پر بیٹھے کتنی دیر سے باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے معاشرے سے اخلاقیات کا تو جنازہ نکل گیا ہے۔ اب وہ میرے پڑوسی میر صاحب کو دیکھو جب دیکھو بیگم کو موٹر سائیکل پہ بٹھائے بغیر پردہ کے سیر کرواتے پھر رہے ہیں۔

ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو وہ میرے پڑوس میں نہیں ہیں اپنا خالد صاحب۔ ہاں ہاں جانتا ہوں اسے۔ توبہ توبہ جب بھی اس کے گھر کے پاس سے گزرو فلمی گانوں اور موسیقی آواز آ رہی ہوتی ہے اور تو اور جوان بیٹیاں ہیں اس کی بالکل بے باک۔ بس یار ہمارے جیسے لوگوں کا تو اس معاشرے میں رہنا دوبھر ہو گیا ہے۔ بالکل۔ ابھی وہ سامنے دیکھو اس عورت کو۔ لباس دیکھو اور کتنی بے شرمی سے سر سے دوپٹا اُتارے جا رہی ہے۔ مگر وہ سر جھکائے دوسری طرف دیکھنے لگا کیوں کہ جانے والی خود اس کی اپنی بیوی تھی...

مقبول شاعر عبدالحمید عدمؔ کے یومِ ولادت پر منتخب اشعار

بطورِ اظہارِ عقیدت

آنکھ کا اعتبار کیا کرتے
جو بھی دیکھا وہ خواب میں دیکھا

آنکھوں سے پلاتے رہو ساغر میں نہ ڈال
اب ہم سے کوئی جام اُٹھایا نہیں جاتا

اجازت ہو تو میں تصدیق کر لوں تیری زلفوں سے
سنا ہے زندگی اک خوبصورت دام ہے ساقی

اک حسیں آنکھ کے اشارے پر
قافلے راہ بھول جاتے ہیں

اے دوست محبت کے صدمے تنہا ہی اٹھانے پڑتے ہیں
رہبر تو فقط اس رستے میں دو گام سہارا دیتے ہیں

اے غمِ زندگی نہ ہو ناراض
مجھ کو عادت ہے مسکرانے کی

بارش شراب عرش ہے یہ سوچ کر عدمؔ
بارش کے سب حروف کو الٹا کے پی گیا

بعض اوقات کسی اور کے ملنے سے عدمؔ
اپنی ہستی سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے

پہلے بڑی رغبت تھی ترے نام سے مجھ کو
اب سن کے ترا نام میں کچھ سوچ رہا ہوں

آوارگی کا شوق بھڑکتا ہے اور بھی
تیری گلی کا سایہ دیوار دیکھ کر

آنکھوں کے تصادم میں حکایات کی دنیا
ہونٹوں کے تصادم میں خرابات کا عالم

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

توبہ کا تکلف کون کرے حالات کی نیت ٹھیک نہیں
رحمت کا ارادہ بگڑا ہے برسات کی نیت ٹھیک نہیں

خالی ہے ابھی جام میں کچھ سوچ رہا ہوں
اے گردشِ ایّام میں کچھ سوچ رہا ہوں

تکلیف مٹ گئی مگر احساس رہ گیا
خوش ہوں کہ کچھ نہ کچھ تو مرے پاس رہ گیا

جن سے انساں کو پہنچتی ہے ہمیشہ تکلیف
ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اصل خدا والے ہیں

جیب خالی ہے عدمؔ مے قرض پر ملتی نہیں
ایک دو بوتل پہ دیواں بیچنے والا ہوں میں

دروغ کے امتحاں کدے میں سدا یہی کاروبار ہوگا
و بڑھ کے تائید حق کرے گا وہی سزاوار دار ہوگا

سو بھی جا اے دلِ مجروح بہت رات گئی
اب تو رہ رہ کے ستاروں کو بھی نیند آتی ہے

اقی مجھے شراب کی تہمت نہیں پسند
جھ کو تری نگاہ کا الزام چاہیئے

زخمِ دل کے اگر سیے ہوتے
اہلِ دل کس طرح جیے ہوتے

یہ کیسا نشہ ہے، میں کس عجب خمار میں ہوں
تو آ کے جا بھی چکا ہے، میں انتظار میں ہوں
منیر نیازی

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG 4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- ✓ Company incorporation / Registered Office Address
- ✓ Personal Income Tax Return investigations,
- ✓ Rental Income Tax Returns
- ✓ UK State Pension Entitlement Review
- ✓ Advice on filling Gaps in UK State Pension
- ✓ UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- ✓ Private UK Pension Tracing.
- ✓ Assets Review for Inheritance Tax
- ✓ Appealing-Past years HRMC Penalties
- ✓ Preparation / Filing of Prior year tax returns
- ✓ Duplicate-Payslips/ P60s

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD KHAN ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD MORDEN SURREY SM4 5HP UK
TEL +44(0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002
E-MAIL: INFO@SARMADGLOBAL.COM
WEB. WWW.SARMADGLOBAL.COM
CELL +44 (0) 7903 416966

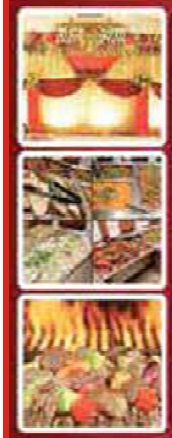

SAAMS FUNCTION HALL
Catering & Event Management

Services Available
- Catering Service
- Special Events
- Corporate Event
- Linen
- Crockery
- Cutlery
- Fresh Flowers
- Drinks
- Stages Decore
- Barbecue Hire

Enquire for a Booking

Catering to your requirments
Cell:07883 815195

Under New Management
Newly Refurbished function Hall

TRANSLATIONS
ENGLISH - URDU

ATA TAHIR
DPSI ENGLISH LAW

IOLET DIPLOMA IN PUBLIC SERVICE
Interpreting Urdu-English Law

07818210181
atatahir@hotmail.com

HEATING LTD.

24/7 EMERGENCY SERVICE

Domestic & Commercial
Contact: 07722 222 965
www.247breakdownsolution.co.uk

SHARIF JEWELLERS
SINCE 1952

Timeless Jewels, Priceless Memories

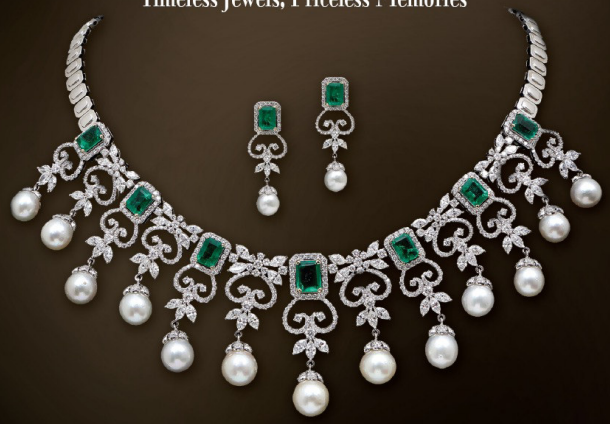

Diamond • Gold • Kundan • Bespoke • Bridal Jewellery
Jewellery Repairs • Bullion Dealer • Best Jewellery Appraisal

WEDDING | PARTY | EVERYDAY

/SharifJewellers

LONDON
28 London Road, Morden
United Kingdom, SM4 5BQ
+44 (20) 3609 4712
+44 (0) 7405 929 636

RABWAH
Aqsa Road, Rabwah
Pakistan, 35460
+92 (47) 6212515
+92 (0) 307 465 7777

RASHID & RASHID

Solicitors, Advocates
Immigration Specialists
Commissioners of Oaths

راشد احمد خان

وکیل (پرنسپل)

Benefit with very competitive rates, tailored advice & service to suit your specific needs, 24 hour response to all online enquiries and our many years of experience

www.rashidandrashid.co.uk

مناسب ریٹس میں آپ کی مخصوص ضروریات کے تحت موزوں مشورہ، 24 گھنٹے آن لائن سروس اور ہمارا سالوں کا تجربہ

- Asylum & Immigration
- New Point Based System
- Settlement Application (ILR)
- European Law
- Nationality & Travel Documents
- Human Rights Applications
- High / Court of Appeals
- Family Matters and Divorce
- Switching Visas
- Over Stayers
- Legacy Cases
- Work Permits
- Visa Extensions
- Judicial Reviews
- Tribunal Appeals
- Student appeals

- اسائلم/سیاسی پناہ اور امیگریشن
- نیا پوائنٹ بیسڈ امیگریشن سسٹم
- ویزا میں تبدیلی
- ویزا توسیع/ایکسٹینشن
- سیٹلمنٹ درخواست (ILR)
- یورپین قانون
- اوور سٹیئرز
- جوڈیشل ریویو
- نیشنیلٹی اور سفری دستاویزات
- درخواست برائے انسانی حقوق/ہیومن رائٹس
- وراثتی معاملات/لیگیسی کیس
- ٹرائبیونل اپیل
- ہائی/کورٹ آف اپیل
- طلاق و دیگر خاندانی معاملات
- ورک پرمٹ
- سٹونٹس اپیل

FREE CONSULTATION & LEGAL ADVICE
24 Hours Emergency Numbers

مفت قانونی مشاورت
24 گھنٹے ایمرجنسی سروس

07878 33 5000 / 07774222062

RASHID & RASHID LAW FIRM
211, The Broadway, Southall, UB1 1NB.
Near McDonalds Southall.
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

190 Merton High Street, Wimbledon
London SW191AX
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

راشد اینڈ راشد لاء فرم
211، وابراڈوے، ساؤتھ ہال، UB1 1NB نزد میکڈونلڈز ساؤتھ ہال
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

190 میرٹن ہائی سٹریٹ، ویمبلڈن
لندن SW19, 1AX
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

SOW THE SEEDS OF LOVE